لغو ہین، غرر الحکم و درر الکلم خود جس سے یہ فضائل نقل کئے گئے ہین، رطب و یابس کا مجموعہ ہے، فضائل وہی صحیح ہین جو صحیح حدیثون سے ثابت ہین، اور اس کی صحت کا اندازہ ہر شخص ذوقِ سلیم سے کر سکتا ہے، باقی سب خرافات ہین، اس پہلو سے قطع نظر یہ کتاب مفید ہے،

عطرِ حیات جناب حکیم میر زین العابدین صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۸ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہت معمولی قیمت ۸؍ مرتبہ ہمدرد بک ڈپو نیو مارکٹ بنگلور سٹی،

مصنف مغربی ہند کے باشندے اور ندوہ کے ابتدائی دور کے تعلیم یافتہ ہین، طب کی تعلیم طبیہ کالج دہلی مین پائی ہے، ان کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے سیاحت کا شوق اور قومی و ملی کامون سے دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اسی زمانہ مین انھون نے تقریباً پورے ہندوستان کی سیاحت کی اور مختلف قومی کامون مین حصہ لیتے رہے جس کا سلسلہ وطن مین بھی جاری ہے اور انھون نے بہت سے مفید قومی کام انجام دیئے، اس کتاب مین انھون نے طالب علمی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک کے حالات تحریر کئے ہین، اس سلسلہ مین اُن کی سیاحت اور قومی کامون کے حالات بھی آگئے ہین، کتاب مفید اور دلچسپ ہے اور اس سے آج سے تیس چالیس سال پہلے کے بہت سے تاریخی واقعات سامنے آجاتے ہین،

قصص النبیین (حصہ اول و دوم) مؤلفہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع بڑی، ضخامت علی الترتیب ۶۴ و ۵۶ صفحات مجلد مکتبہ عربیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملیگی،

عربی تعلیم کے لئے جدید طرز کی جو ریڈرین لکھی گئی ہین، وہ عموماً بے مقصد قصہ کہانیون پر مشتمل ہین، اسلئے فاضل مؤلف نے بچون کی عربی تعلیم کے ساتھ اُن کی دینی تربیت، مذہبی معلومات اور قرآن مجید سے اس کو مانوس کرنے کے لئے قرآن کے قصص الانبیاء سے یہ ریڈرین مرتب کی ہین، دوسرے حصہ مین بیشتر آیات قرآنی ہی کے ٹکڑے ہین قصہ کو مربوط کرنے کے لئے بیچ بیچ مصنف کے قلم کی عبارتین بھی ہین، مگر ان کو عربی زبان پر اہلِ زبان جیسی قدرت حاصل ہے، اس لئے یہ ریڈرین مذہبی تعلیمی اور ادبی مختلف حیثیتون سے اس قابل ہین کہ اُن کو عربی تعلیم کے ابتدائی نصاب مین شامل کیا جائے،

"م"

جلد ۷۲ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

آثارِ علمیہ و ادبیہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آہ سید صاحب!

علم و اخلاق کی دُنیا اُجڑ گئی

رفتی و از رفتنِ تو عالمے تاریک شد　　تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

آہ گذشتہ مہینہ ۲۲ نومبر کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو ۸ بجے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، یہ خبر وابستگانِ دامنِ سلیمانی کے لئے ایسی ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گیا، مگر مشیتِ الٰہی پوری ہو کر رہی، اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحا نفس نے بھی جان جان آفرین کے سپرد کر دی، جو عمر بھر اپنی زبان و قلم سے مردہ دلوں میں روحِ حیات پھونکتا رہا، اور امراضِ ملت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا، جس نے اس کے ناتوان جسم میں نئی طاقت و توانائی پیدا کی، وہ چشمۂ فیض خشک ہو گیا، جس کی آبیاری سے دین و ملت کا چمن سیراب تھا، وہ شیخ کامل اُٹھ گیا جس نے دلوں کی دنیا منور کی، وہ شمع خاموش ہو گئی، جو نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس میں ضیا بار رہی، وہ تاجدار رخصت ہو گیا، جس کا سکہ علم و فن کی پوری اقلیم میں رواں تھا، اسلامی علوم کا وہ امام و مجدد اٹھ گیا، جس نے اُن کو نئی زندگی بخشی، مذہبِ اسلام کا وہ متکلم اور اسلامی تاریخ و تمدن کا وہ محقق اٹھ گیا، جس نے اُن کو اُن کی اصل شکل اور نئے لباس

میں جلوہ گر کیا، پیغامِ محمدی کا وہ شارح و ترجمان خاموش ہو گیا جس نے اپنی دینی بصیرت سے اُس کے اسرار و حکم بے نقاب کئے، اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہو گیا،

لیس من اللّٰہ بمستنکر　　ان یجمع العالم فی واحد

وہ مذہب و سیاست، علم و فن، تالیف و تصنیف، تعلیم و تدریس، تقریر و تحریر، انشا و خطابت، وعظ و پند، ارشاد و ہدایت، ہر مجلس کا صدر نشین، اور اپنے علمی کمالات میں ائمہ سلف کی یادگار تھا، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، مغازی و سیرت، طبقات و تراجم، تاریخ و جغرافیہ، شعر و ادب جملہ فنون پر اس کی نظر مجتہدانہ، اور اس کے زبان و قلم کی روانی و حکمرانی یکساں تھی، اور ان میں وسعت و دقتِ نظر، فہم و بصیرت، تلاش و تحقیق، اور مہارتِ فن کی ایسی یادگاریں چھوڑ دیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں گی، اس کے علمی کمالات کا لوہا دنیائے اسلام کے نامور علما اور یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے،

وہ جدت و قدامت کا سنگم، اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار و تصورات، نئے رجحانات اور عہدِ حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش و تحقیق اور نقد و نظر کے جدید طریقوں کا بھی ماہر تھا، اس دور کا وہ پہلا متکلم ہے، جس نے اسلامی علوم اور مذہبی عقائد و خیالات پر فکر و تدبر، اور اُن کی تعبیر و ترجمانی کا ایسا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ دین و مذہب، نقل و روایت اور سلفیت و قدامت کی روح کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان سے عقل و درایت اور جدت و روشن خیالی کی نقیض مٹا دی، اور اُن کو ان کا معاون و مددگار بنا دیا، اُم

مذہب اسلام، اسلامی تاریخ، اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے معترضین اور نکتہ چینیوں کی جہالت کا پردہ چاک کرکے اُن کو ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز مین پیش کیا کہ مخالفین و منکرین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہوگئے، اور علمائے اُمت نے بھی اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا، اور اس طرز فکر اور طریقۂ تعبیر کی ایسی شاہراہ قائم کردی کہ آج اس راہ کے سارے راہرو اسی راستہ پر گامزن ہین،

—— ••• ——

اس کی ذات مین روشن ضمیری و روشن دماغی، ذوق کے تنوع، علوم کی جامعیت، عقائد مین رسوخ و پختگی، اعمال مین استقامت، ثقاہت و متانت، قلب و نظر کی وسعت، مسلک مین اعتدال و توازن، لوچ اور نرمی، حسن مذاق، اور لطافت مزاج کا ایسا عجیب و غریب اجتماع تھا کہ طبقۂ علماء مین اس کی نظیر مشکل سے ملیگی، اور اس مسلک اعتدال کا وہ مبلغ بھی تھا، اس لئے مختلف مشرب و مسلک کے مسلمانون مین وہ مقبول رہا،

—— ••• ——

اس کا مزاج و مذاق ابتدا سے دینی تھا، کسی دور مین بھی اس کا قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا، اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، اور آخر مین تو سیرۃ النبی کی برکت اور سلوک و تصوف کے فیض سے ہو بہو سلف صالحین کی تصویر، اور سراپا کیف و اثر بن گیا تھا، اس کی صحبت مین بیٹھ کر، اس کی باتین سُن کر اور اس کی صورت دیکھ کر ایمان مین تازگی پیدا ہوتی تھی، اس کے اعمال و اخلاق "خلق عظیم" کی عملی تفسیر تھے، وہ فطرۃً پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت، سراپا خلق و مروت، سراپا مہر و محبت اور سراپا جمال تھا، عزیزون کا معاون و مددگار، دوستون کا ہمدرد و غمگسار اور غریبون اور بےکسون کا ہمدم و غمخوار تھا، ضبط و تحمل کا پہاڑ، ایثار و قربانی کا پیکر اور عفو و درگذر کی تصویر تھا، اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی، اس لئے مصنوعی

اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے کبھی نہین پڑا، اور دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر و نخوت سے نفور رہا،

—— ••• ——

اس کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور حلم و عفو کا نمونہ تھی، اور یہ وصف حد اعتدال سے بڑھ گیا تھا، اس کا سینہ بےکینہ، اور اس کا دل ایسا شفاف و مجلی آئینہ تھا جس مین دشمن کے لئے بھی گرد کدورت کی گنجایش نہ تھی، اُس نے قدرت و اختیار کے باوجود کبھی دشمنون سے بھی انتقام نہین لیا، اور بداندیشون کے ساتھ بھی ہمیشہ بھلائی کی، اور اس کے لئے ہر نقصان گوارا کیا، اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا، اس لئے وہ محبوب القلوب تھا، اور اس کی عزت و محبت دلون مین جاگزین تھی، جو عند اللہ اس کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی سند ہے، قلم اس کے کمال و جمال کی مصوری سے عاجز و درماندہ ہے، اس کی جو تصویر کھینچی جائے گی، وہ ناقص و ناتمام ہی ہوگی،

ع ہر چند مدحت می کنم لیکن ازان بالاتری

—— ••• ——

ملک و قوم، دین و ملت اور علم و فن کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو بھی اس کے خدمات سے خالی نہین ہر ایک راہ مین اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گوناگون ہین، اس لئے اس کی موت درحقیقت ایک حادثہ نہین مجموعۂ حوادث ہے، اور اس کا ماتم ایک شخص ایک صفت، ایک کمال، ایک قوم اور ایک ملک کا ماتم نہین، بلکہ دین و مذہب کا ماتم ہے، ملک و ملت کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، علم و فن کا ماتم ہے، خلق و شرافت کا ماتم ہے، اور پوری ملت اسلامیہ اس کے غم مین سوگوار ہے، کہ آج غزالی و رازی، ابن تیمیہ و ابن قیم، رومی و سنائی شاہ عبد الحق اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار دنیا سے اٹھ گئی اور شبلی کی مسند ویران ہوگئی، ایسی ہستیان صدیون مین پیدا ہوتی ہین،

سہرو و رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید

برفت از بزم عرفان آن حکیمے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

اُس نے علم و ادب کی ہر شاخ اور ہر موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے، مگر اس کی عمر عزیز کا بڑا اور بہترین حصہ آستانِ نبوی کی خدمت گذاری مین بسر ہوا، اس کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہی، جو سوانحِ نبوی کے ساتھ پیغامِ محمدی کا بھی خلاصہ و عطر ہے، دار المصنفین مین اس کی تصنیفی زندگی کا آغاز اسی مبارک کام سے ہوا تھا، اور ابھی جلد ہفتم زیرِ تالیف تھی کہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا، اور رحمۃ للعالمین کا مداح و سیرت نگار یہ سوغات لے کر خود اُس کے حضور مین حاضر ہوگیا،

ع :- خدا کا شکر ہے یون خاتمہ بالخیر ہونا تھا،

(٥)

بارالٰہا! تیرے دین متین کا خادم، تیرے پیغام کا شارح و مبلغ تیرے محبوب نبی کا جگر گوشہ و سیرت نگار تیرے حضور مین حاضر ہی، اس کے طفیل مین اس کو اپنے دامنِ رحمت سے ڈھانک لے، اس کو شہدا و صدیقین کا درجہ عطا اور اس کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے معمور و منور اور جنت الفردوس کے پھولون سے معطر فرما، اللّٰھم صبب علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین آمین،

اے خدا کے مقبول بندے الوداع اے استادِ شفیق الفراق

اس حادثہ کے سلسلہ مین بکثرت تعزیتی خطوط اور قطعات تاریخ موصول ہوئے ہین، ہین نے بیشتر خطوط کا جواب دیدیا ہے، لیکن سب کو فرداً فرداً جواب دینا دشوار تھا، اس لئے جن اصحاب کو جواب نہ ملا ہو وہ معذرت قبول فرمائین، کارکنانِ دار المصنفین ان سب کی ہمدردیون کے شکر گذار ہین، پسندیدہ قطعات تاریخ رفتہ رفتہ معارف مین شائع ہوتے رہین گے، اور منتخب قطعات اس کے خاص نمبر مین جو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار مین نکالا جائے گا شائع کئے جائین گے،

مقالات

مسلمانون کا اندلس

(خود مسلمانون کی نگاہ مین)

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۲)

بہرحال یہ نئی حکومت جس نے اچانک دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا قالب اختیار کرلیا تھا، کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ پہلے سے جانی پہچانی بات، اور خدا کا وعدہ تھا، قرآن مین "استخلاف" یعنی مسلمانون کو زمین کی حکومت عطا کی جائے گی، کا وعدہ کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ

لیمکننھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم (النور) — تاکہ جگہ بنائے اس دین کے لئے جسے خدا نے ان کے لئے پسند فرمالیا ہے،

اس دینی دعوت کے لئے جگہ بنانا، اور ممکنہ حد تک اس کے لئے انسانی برادری مین گنجائش پیدا کرتے چلے جانا بھی اس موعودہ حکومت وخلافت کا نصب العین قرآن نے قرار دیا تھا،

خلافتِ راشدہ کو خلافتِ راشدہ اسی لئے کہتے ہین کہ اس عہد مین حکومت کا یہ قرآنی نصب العین پوری قوت کے ساتھ قائم رکھا گیا، اور مسلمانون کی حکومت اس زمانہ مین ٹھیک اپنے نصب العین تک پہنچی ہوئی تھی، اور ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی راہ پر جا رہی تھی جس مقصد کے لئے وہ عطا ہوئی تھی، باوجودیکہ قرآن عربی زبان مین

نازل ہوا تھا، قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خود عربی تھے، جن لوگون کا انتخاب اس آخری دینی دعوت کو عالمگیر بنانے کیلئے کیا گیا تھا، سب سے پہلے اس گروہ مین وہی لوگ داخل ہوئے تھے، جن کا وطن عرب تھا،

اسی دینی دعوت کی عرب مین تو دھوم مچی ہی ہوئی تھی، عرب سے باہر روم و ایران حبشہ اور اس کے سوا بھی بیرونی عرب کے دوسرے حصون مین قاصدون کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا، اور مدینہ جیسی دور دست آبادی مین جب ایران سے آنے والا آتا تھا، تو سلمان منا اہل البیت (سلمان ہمارے گھرانے کے آدمی ہین) کی پیغمبرانہ آواز سے مدینہ کی فضا گونج اٹھتی ہے، حبشی بھی آتے ہین، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کاروبار کا چارج ان ہی بلال حبشی رض کو مل جاتا ہے، عرب و عجم کے قصے ختم ہو رہے تھے خود عرب بھی احرار و موالی یعنی آزاد شرفا اور غلام خاندان کے رذیل کمینے، دو حصون مین بٹے ہوئے تھے، مگر ان ہی موالی مین سے ایک مولیٰ، زید پیغمبر کے فرزند دلبند کے نام سے پکارے گئے، شرافت مآب قریش کے خانوادۂ گرامی کی خاتون سے ان کا عقد جس وقت ہوتا ہے تو سارا عرب کانپ اٹھتا ہے، اور وہی زید رض بن حارثہ ان شرفا کو اپنی ماتحتی مین اس فوج کو لے کر عرب کے شمال و جنوب مشرق و مغرب مین جاتے ہین جس فوج کے زیادہ ارکان عرب کے شریف آزاد خاندانون سے تعلق رکھتے تھے، اس سلسلہ کی جس آخری مہم کو رومیون کے مقابلہ روانہ کرکے پیغمبر وفات کے بستر پر آرام فرما ہوئے تھے، اس فوج کے سپہ سالار بھی ان ہی مولیٰ زید کے صاحبزادے اسامہ تھے،

ان واقعات کی کہان تک تفصیل کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ قومی عصبیت خواہ کسی راہ سے پیدا کی جائے، نسل کی راہ سے، زبان کی راہ سے، ملک کی راہ سے، وطن کی راہ سے سب ہی کی حیثیت وہی ہو گئی تھی، جو اسلام کے مقابلہ مین کفر کی تھی[1]،

---

[1] ابن عساکر نے تاریخ دمشق مین نقل کیا ہے، کہ ضرار بن الخطاب ایک قریشی عرب تھے، انھون نے قسم کھا رکھی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے قبیلہ مضر کے کسی آدمی کو کبھی قتل نہ کرون گا، احد کی جنگ مین قریش کی طرف سے مسلمانون کے مقابلہ مین وہ بھی آئے تھے گھمسان کا رن جب پڑا تو عبداللہ بن جحش رض صحابی جو قبیلہ مضر ہی کے تھے، ضرار کی تلوار کے سامنے آگئے، یہ دیکھ کر چلانے لگے، کہ ابن جحش

تب تو تکے بعد خلافت راشدہ کے عہد مین بھی سیدنا بلال کہتے کہتے، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان خشک ہو رہی تھی، سالم مولیٰ حذیفہ کی وفات پر فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانون کی خلافت کا حقدار میرے بعد یہی مولیٰ سالم تھا، وفات ہو رہی ہے، سانس اکھڑ رہی ہے لیکن اس وقت بھی عمر فاروق کہے جاتے ہین، جب تک خلیفہ کا انتخاب نہ ہولے، رومی صہیب میری جگہ مسلمانون کو نماز پڑھاتے رہین، چنانچہ وہی پڑھاتے رہے، اور سارے مہاجرین و انصار، اور عرب کے اشراف و احرار ان ہی کی امامت مین نماز ادا کرتے رہے،

مسلمانون ہی کی تخصیص نہین، بلکہ اگر ایک طرف خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیون کو اپنی پاک مسجد مین نماز ادا کرنے کی اجازت عطا فرماتے ہین، تو دوسری طرف بیت المقدس کے گرجے کا پادری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کر رہا ہے کہ کچھ حرج نہین، آپ گرجے کے اندر نماز ادا فرما سکتے ہین، مگر حضرت عمر رض فرماتے ہوئے کہ

لو صلیت داخل الکنیسۃ اخذھا	اگر گرجے کے اندر آج مین نماز پڑھ لون گا
المسلمون بعدی وقالوا ھنا صلی	تو میرے بعد مسلمان اس گرجے کو یہ دعوی پیش
عمر (ابن خلدون)	کرکے کہ عمر نے اس مین نماز پڑھی، تم سے
	چھین لین گے،

پھر جس نماز کا وقت آگیا تھا، اس کو گرجے سے باہر سیڑھیون پر ادا کرکے ایک تحریری وثیقہ لکھ کر پادری کے حوالہ کرتے ہین، جس مین لکھا تھا،

"اس سیڑھی پر کوئی نہ نماز ہی ادا کرے، اور نہ اذان دے،"

(ابن خلدون ج ۲ ص ۲۲۵)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۶) میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، تم مضری ہو، اس لئے مین تم کو مارنا نہین چاہتا، عبداللہ بن جحش نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے دشمن کفر کے ساتھ تیری اس عصبیت رشتگی، نے تو تیرے قتل کو میرے لئے زیادہ محبوب بنا دیا ہے، (ج ۲ ص ۲۲)

گویا کفر اور عصبیت دونون کی حیثیت ان کی نظر مین برابر تھی،

اپنے نصرانی غلام اُستق کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں، لیکن اُن کے جیتے جی اُستق اس کے قبول کرنے سے انکار ہی کرتا رہا، وفات جب ہونے لگی تو اسی کا بیان ہے کہ عمرؓ نے مجھ کو آزاد کر دیا، (ابن سعد ج ۶ ص ۱۱۰)

نصرانی غلام کے ساتھ اس سلوک نے اُستق کے دل میں حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اسلام کیلئے جگہ بنالی، یہ بھی سوچنے کی بات ہے، روم و ایران کے مقبوضات عہدِ فاروقی ہی میں اسلامی مفتوحات میں شامل ہو چکے تھے، لیکن خلافتِ راشدہ کا پورا دور گذر گیا، لیکن کسی کے دل میں خیال تک نہ آیا کہ دفاتر کی زبان ایرانی علاقوں میں فارسی اور رومی علاقوں میں رومی کیوں ہو؟ البلاذری نے لکھا ہے کہ

کان دیوان خراج السواد وسائر	سواد اور سارے عراق (ایرانی مقبوضات)
العراق بالفارسیۃ (صفحہ ۳۰۰) ولم	کی مالگذاری کا دفتر فارسی میں اور شام کی
یزل دیوان الشام بالرومیۃ، (ص ۲۰۱)	مالگذاری کا دفتر رومی میں تھا،

اس کی وجہ یہی تھی کہ دین یا انسانی زندگی کا قدرتی آئین جو دنیا کی ساری قوموں کا مشترک موروثی سرمایہ تھا، اس کو آخری مکمل ترین شکل میں ممکنہ حد تک تمام قوموں تک پہنچانے اور بنی آدم کے گھرانوں میں اس کی گنجائش پیدا کرنے ہی کی کوششوں پر اس استخلافی حکومت کی توجہ مرتکز تھی، جو مسلمانوں کے سپرد ہوئی تھی، اس تمکین فی الارض کے نصب العین کی تکمیل کے لئے کسی خاص زبان یا کسی خاص قوم کے کلچر، یا تہذیب و تمدن کے لئے زمین میں جگہ اور گنجائش پیدا کرنا اس حکومت کا مقصود ہی نہ تھا،

اس بلند نصب العین کے مقابلہ میں قوموں پر زبردستی کسی زبان، یا کلچر، یا تہذیب و تمدن کو تھوپنے، اور اس کو خواہ مخواہ ان کے سروں پر منڈھنے کی تنگ نظری کی راشدہ خلافت میں گنجائش ہی نہیں تھی، اسی خلافت کا ایک خلیفہ[1] مسلمان کو قصاص کے لئے بٹھاتا ہے، اور غیر مسلم کے ہاتھ میں تلوار دے کر حکم دیتا ہے کہ

"اپنے مقتول رشتہ دار کے بدلہ میں اس مسلمان کی گردن اڑا دو"

(۱) یہ فیصلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں دیا تھا، دیکھو (احکام القرآن رازی)

اس حکم کے بعد مسلمانوں کی طرف مخاطب ہو کر سمجھاتا ہے کہ

"یہ میں نے اس لئے کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری حکومت کے غیر مسلم باشندوں کا خون بھی مسلمانوں کے خون کے برابر ہے، اور دونوں کے خون کا معاوضہ بھی مساوی ہے"

خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلم مقتول کے معاوضہ میں مسلمان قاتل کو قتل کراتے ہوئے فرماتے جاتے ہیں،

انا احق من وفی بذمتہ،	اپنی ذمہ داری کی پوری کرنے کا میں سب سے زیادہ
(ج ۱ ص ۱۲۴)	حقدار ہوں،

مگر اس استخلافی حکومت کے مذکورۂ بالا قرآنی نصب العین یعنی دین کے لئے تمکین فی الارض کا رشد اور اس کی سوجھ بوجھ کا جوش دھیما پڑتے پڑتے بالآخر انحطاط کے اس نقطہ تک پہونچ گیا کہ ایک حال جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے یہ تھا:-

کان سالم مولی ابی حذیفۃ یؤم	ابو حذیفہ کے مولی (غلام) سالم قبا کی مسجد
المہاجرین والانصار فی مسجد	میں امامت کرتے تھے، مہاجرین اور انصار
قباء فیہم ابوبکر و عمر،	کی جن میں ابوبکر و عمر بھی ہوتے،

مگر پھر انہی بیچارے موالی کے ساتھ اسی عرب میں یہ معاملہ بھی کیا جا رہا تھا کہ اتفاقاً انہی موالی میں سے کسی مولی کے پیچھے کوئی شریف عرب نماز پڑھ لیتا، تو پوچھنے والے حیرت سے پوچھتے کہ تم نے اس کے پیچھے نماز پڑھی؟ اس سوال سے زیادہ عبرت انگیز یہ جواب تھا کہ

انما اردت ان اتواضع للہ بالصلوٰۃ	اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کی غرض یہ ہو کہ
خلفہ،	خدا کے سامنے اپنی فروتنی اور تواضع کا اظہار
(عقد الفرید جلد ۲ ص ۶۳)	کر دوں،

گویا مولی کے پیچھے نماز ایک قسم کا مجاہدہ تھا، اور یہاں تک تو پھر بھی غنیمت ہے، اسی عقد الفرید میں موالی اور

غیر عربی مسلمانوں کے متعلق بدلے ہوئے نقطۂ نظر کے جن نتائج کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کو پڑھ کر حیرت ہو جاتی ہے، شرفائے عرب کے مقابلہ مین اُن کے ساتھ جو امتیازی برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی فہرست صاحب عقد الفرید نے یہ نقل کی ہے،

۱- ان موالی کو نہ کنیت سے پکارا جاتا تھا، اور نہ نام کے سوا اور کسی دوسرے لفظ سے خطاب کا استحقاق ان کو حاصل تھا،

۲- صف مین شرفائے عرب کے برابر چلنے کا حق موالی کو نہ تھا،

۳- اور نہ کسی جلسہ جلوس مین موالی آگے رہ سکتے تھے،

۴- دعوت مین قاعدہ مقرر تھا کہ جب تک شرفائے عرب کھانا کھاتے رہین، موالی اور غیر عربی مسلمان کھڑے رہین،

۵- کسی وجہ سے عرب کے شرفا اپنی دعوتون مین علم یا فضل کی عام شہرت کی وجہ سے کسی مولیٰ (یعنی غیر عرب مسلمان) کو مدعو بھی کرتے، تو ان کو ایسی جگہ بیٹھ کر کھانا کھلایا جاتا، جو شرفا کے دسترخوان سے الگ ہوتی تاکہ ہر شخص پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ عربی نہین ہے،

۶- جس جنازہ مین کوئی عربی شریک ہوتا تو اس مین موالی کو نماز پڑھنے کے لئے نہین بلایا جاتا تھا،

بلکہ اس سے بھی زیادہ عربی اور غیر عربی مسلمانون مین ترجیحی سلوک کی ابتدا، خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی، ایک قریشی صاحب کا یہ لطیفہ عقد الفرید ہی مین نقل کیا گیا ہے کہ ان کا دستور تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی جنازہ گذرتا تو پوچھتے کہ کس کا جنازہ ہے، اگر کہا جاتا کہ قریش کا ہے تو واقوماہ (ہائے میری قوم) کہتے ہوئے چیخ اٹھتے، اور اگر سنتے کہ کسی غیر عربی کا جنازہ ہے، تو کہتے وابلدتاہ (ہائے رے میرا ملک) اور اگر معلوم ہوتا کہ کسی غیر عربی مسلمان کا ہے تو کہتے کہ

"اللہ کا مال تھا، جس مال کو اپنے چاہے لے لے، اور جسے چاہے، چھوڑ دے،

(عقد الفرید ج ۲ ص ۷۳)

کچھ دن تک تو افراد میں مذکورۂ بالا انحرافی میلانات کی پرورش ہوتی رہی تا آنکہ جب حکومت کی باگ مروانی خاندان والون کے ہاتھ مین آئی تو اسکے پہلے خلیفہ عبد الملک بن مروان کے جو جذبات اس باب مین تھے اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سیدنا امام زین العابدین نے کسی غیر عربی خاتون کو جو مولاۃ (لونڈی) تھین، آزاد کر کے بیوی کا مرتبہ عطا کیا، عبد الملک کو خبر ہوئی تو آپے سے باہر ہو گیا اور غصہ مین ایک خط حضرت والا کے نام لکھ کر مدینہ روانہ کیا، جس کا حاصل تھا کہ قریش کے دامن شرافت کو اپنی اس حرکت سے تم نے داغدار کر دیا، اہل بیت نبوت کے چشم و چراغ سے جس جواب کی توقع تھی، وہی جواب عبد الملک کو ملا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک نمونہ کی مین نے پیروی کی، اور نبوت کا جو منشا تھا، اسی کی تعمیل کی سعادت مین نے حاصل کی ہے، (ابن سعد ج ۵ ص ۱۵۶)

بہرحال عوام کے ہاتھ مین تو اختیار تھا نہیں، اس لئے حکومت کا اقتدار جب عبد الملک کے ہاتھ مین آیا، تو پہلا انقلابی قدم اُس نے یہ اٹھایا کہ فارسی اور رومی زبانون مین (خراج) مالگذاری کے جو دفاتر خلافت راشدہ مین بھی اپنے حال مین چھوڑ دیئے گئے تھے، لاکھون لاکھ روپیے کے صرف سے اُن کی زبان عربی کر دی گئی، رومی دفتر کے انچارج آفیسر سرجون نامی عیسائی کو جب عبد الملک نے یہ فرمان سنایا، تو اس کا خون خشک ہو گیا، اور اس نے دفتر کے کام کرنے والے عملہ کو جن کی تعداد ہزارون سے متجاوز تھی، بلا کر یہ الفاظ کہے،

"دفتری نوشت و خواند تمہاری روزی کا جو ذریعہ تھا، اس سے تم محروم کر دیئے گئے"،

(البلاذری ص ۲۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی آخری دعوت کے لئے جگہ بنانے یا تمکین فی الارض کے لئے جن امور کی ضرورت تھی، حکومت کی نگاہون مین اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی تھی، سوچنے کی بات ہے کہ دفاتر کی زبان کی اس تبدیلی سے اسلامی مقبوضات مین رہنے والے باشندون کی کتنی بڑی تعداد روزی کے ذرائع سے محروم ہو گئی ہوگی، اگر ان غریبون کی معاش کے نئے ذرائع حکومت کھول دیتی تو جو چاہئے ہو سکتا تھا مگر اس سے پہلے عبد الملک کے اس اقدام سے خدا ہی جانتا ہے کہ ملک کے کتنے باشندے متاثر ہوئے ہون گے، اور ان کے قلوب مین

اسلام اور مسلمانون کی طرف سے جس قسم کے جذبات پیدا ہوئے ہون گے، اُن کا اندازہ کرنا دشوار نہین ہے، اس سے عربی زبان کی تمکین، اور اُس کے لئے نئی جگہ ضرور پیدا کی گئی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس خلافت کا وعدہ قرآن مین مسلمانون سے کیا گیا اس کا نصب العین خود قرآن ہی نے کیا متعین کیا تھا، اسی سے یہ سمجھ مین آجاتا ہے کہ خلافت جب تک اپنے نصب العین کے لحاظ سے کامل رشد اور سوجھ بوجھ کی حالت مین رہی، اس وقت تک دفاتر کی زبان بدلنے کی طرف توجہ نہ کی گئی،

اور اس قصہ مین تو حکومت کی غیر مسلم رعایا ہی کیا تھے بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا، لیکن مروانیون کی اسی حکومت مین غیر عربی مسلمانون تک کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھا گیا، یعنی ابتدائے حکومت سے آخر تک حکومت مین ملازمت کا سوال تو الگ رہا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہے کہ غیر عربی مسلمان علما سے جن مین خود امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، کبھی کوئی قانونی اور فقہی سوال تک نہ پوچھا جاتا تھا، کوفہ کا آخری مروانی گورنر ابن ہبیرہ پہلا شخص ہے جس نے مجبور ہو کر امام ابوحنیفہ سے بعض مسائل مین مشورہ لیا تھا، (تفصیل کے لئے میری کتاب امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کیجئے) غیر عربی مسلمانون کے ساتھ حکومت کا تو یہ برتاؤ تھا لیکن یہی طرز عمل غیر عربی مسلمانون کے ایمان و اخلاص کے امتحان کا ذریعہ بن گیا، اور ان ساری بے اعتنائیون کے باوجود سارے اسلامی ممالک کے مرکزی مقامات مین دین اور دینی علوم کی خدمت و نشر و اشاعت مین زیادہ تر غیر عربی مسلمان مصروف تھے،

عام مسلمانون کے قلوب ان غیر عربی مسلمانون کے اخلاص و صداقت سے قدرۃً متاثر ہوتے تھے، مگر مروانیون پر یہ بھی شاق تھا چنانچہ عبدالملک کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے شہاب زہری سے ہر ہر شہر اور قابل ذکر آبادیون کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ وہان کا دینی مقتدا کون ہے، زہری ہر سوال کے جواب مین مسلسل غیر عربی النسل مسلمانون ہی کے نام بتلائے چلے جاتے تھے، اور عبدالملک کا چہرہ سیاہ پڑتا جاتا تھا، آخر مین جب کوفہ کے متعلق زہری نے بیان کیا کہ آج کل وہان کے دینی پیشوا ابراہیم نخعی ہین، جو نسلاً عربی ہین

اس وقت اس کے دل کی دھڑکن کچھ کم ہوئی، اور بے ساختہ بول اٹھا،

ویلك یا زهری فرّجت عني،	برا ہو، تمھارا زہری! اب جا کر تم نے مجھے شگفتہ
(معرفة علوم الحديث للحاكم ص ۱۹۹)	ہونے کا موقع دیا،

ظاہر ہے کہ خلافت کا جو خطِ راشدہ تھا، اس سے جب انحراف شروع ہوا تو کسی حد پر اس کے ٹھہرنے کی صورت ہی کیا تھی، مسلمانون کو کہئے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو عربی و غیر عربی دو حصون مین تقسیم کرتے ہوئے مروانی حکومت آخر مین انحراف کے اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ آج بھی ہم جب اس کا تصور کرتے ہین تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین، علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن مین لکھا ہے کہ

قد كان آل مروان يأخذون الجزية	مروان کے خاندان والے حکمران ان مسلمانون
ممن اسلم من اهل الذمة،	سے بھی جزیہ وصول کرتے تھے، جو پہلے غیر مسلم
	ذمی تھے، اور بعد کو اسلام قبول کر لیا تھا،

اور یہ سزا ان مسلمانون کو صرف اس لئے بھگتنی پڑی کہ بجائے عرب کے وہ بیچارے اس ارض بسیط کے ان حصون مین پیدا ہو گئے تھے، جن پر عرب کے لفظ کا اطلاق نہین کیا جاتا تھا، اس کے سوا ان مین اور عربی نژاد مسلمان مین کوئی فرق نہ تھا،

مروانی حکومت کی وہی حیرت انگیز ایمان آزما، دین گداز، جاہلی جبارت کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر نے کامل مین لکھا ہے کہ ان مسلمانون کو کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیون سے صرف اس قصور مین جس وقت نکالا جا رہا تھا کہ انھون نے اپنے آپ کو زمین کے اس خطہ مین کیون نہ پیدا کیا جس کا نام عرب ہے تو وہ بیچارے روتے جاتے تھے اور

یا محمداہ یا محمداہ

کے الفاظ بے ساختہ ان کی زبانون پر جاری تھے، وہ اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈھ رہے تھے، اور حیران تھے کہ اپنے پرانے غیر اسلامی قبائل سے وہ منقطع ہو چکے تھے، اور عربی مسلمان بھی ان کو عربی چھاؤنیون

سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہے تھے، اُن کی سمجھ مین نہین آتا تھا کہ

این یذہبون،	آخر وہ کہان جائین

اس وقت بصرہ اور کوفہ مین جو علما تھے، وہ بھی ان نکالے جانے والے علما کے ساتھ ساتھ روتے جاتے تھے[1] اس طرح اس مسئلہ مین علما و فقہا کے متفقہ فیصلہ کو مسترد کر کے مسلمانون کی کافی خون ریزی کی گئی، اس اصرار کی انتہا یہ بھی کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ خلافت مین کلنگ کے اس ٹیکہ کو مروانی حکومت کی پیشانی سے حالانکہ مٹا دیا تھا لیکن بقول جصاص :-

لما ولی هشام بن عبد الملک	جب عبدالملک کا بیٹا ہشام تخت نشین ہوا
اعادها علی المسلمین،	تو مسلمانون پر پھر جزیہ کے ٹکس کو اس نے
(احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۳۶)	لگا دیا،

گویا عربی اور غیر عربی تقسیم پر ہشام کی حکومت نے مہر لگا دی، اور اعلان کر دیا گیا کہ حکومت مسلمانون کی حکومت نہین، بلکہ عربی مسلمانون کی ہے، اور عربون کی راہ کے سارے کانٹے ہٹا دیئے گئے لیکن عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر تیس سال سے زیادہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ مروانیون نے عربی مسلمانون کی جو حکومت قائم کر لی تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانون کی تقسیم کے بعد جیسا کہ چاہیئے تھا یہ تقسیم عربی و غیر عربی دو ہی قسمون مین منحصر نہین رہی، بلکہ مروانی حکومت کے آخری زمانہ مین عربی مسلمان بھی نزاریہ اور یمانیہ[2] دو حصون مین منبٹ گئے، اور حکومت کا اقتدار چونکہ نزاری نسل کے ہاتھ مین تھا، اس لئے مروانی حکومت کا آخری خلیفہ مروان بن محمد جیسا کہ المسعودی نے لکھا ہے کھلے بندون

---

[1] ابن اثیر ج ۵ ص ۹، [2] حجاز کے عربون کی اکثریت نزار بن معد بن عدنان کی نسل سے تھی، اسی لئے ان کو نزاری بھی کہتے تھے، اور یمن کے باشندے قحطانی عرب تھے، اسی فتنہ کی تعبیر کبھی مضریہ و قیسیہ سے بھی کی جاتی تھی، تفصیل کے لئے بڑی کتابون کا مطالعہ کیا جائے،

تعصب لقومه من نزار علی الیمن	یعنی عربی مسلمانون کے مقابلہ مین نزاری
(المسعودی بر کامل ابن اثیر ج، ص ۱۰۳)	عربی مسلمانون کی پاسداری کرنے لگا،

اور اس طرح بجائے عربی کے مروانیون کی حکومت "نزاری حکومت" بن کر ختم ہوئی، عربی مسلمانون کی تقسیم کا یہ فتنہ جو مروانیون کے آخری دور مین اٹھ کھڑا ہوا تھا، صدیون تک اس کا اثر باقی رہا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ فتنے کی اس آگ مین کتنی لاکھ جانین ضائع ہوئین اور کتنے شدید نقصانات پہنچے، ہماری تاریخین ان خونی داستانون کے ذکر سے لالہ زار بنی ہوئی ہین، الغرض ایک طرف تو خود عرب تقسیم کے اس عمل جراحی کا تختہ مشق بنا ہوا تھا، اور دوسری طرف عربی زبان کے ساتھ نادانون کی اس دوستی کا آخری انجام اسی مروانی حکومت کے آخری دور مین جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ خراسان مین اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا گشتی فرمان جو خراسان مین عباسیون کی طرف سے بانٹا جا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ

لا یدع بخراسان متکلما بالعربیة	خراسان مین عربی زبان بولنے والا جو بھی
الا قتله، (کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۴۷)	ملے، اسے قتل کر دیا جائے،

حالانکہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور اس کے لئے جگہ بنانے کے قرآنی نصب العین کو اپنے سامنے رکھتی تو عربی مسلمانون مین جراحی کے عمل کی بھی گنجایش نہ پیدا ہوتی، اور اسلام کے طفیل مین عربی زبان بھی قدرتی طور پر آگے بڑھتی چلی جاتی، لیکن قرآن کے بینات سے چشم پوشی اختیار کی گئی، قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونون سے اعراض کیا گیا، اور الٹے انہی لوگون کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو ساری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، شعوبیہ[1] کے نام سے رسوا اور بدنام کیا

---

[1] قرآن کی مشہور آیت یا ایها الناس انا جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا مین "شعوب" کا لفظ جو آیا ہے، جس مین اقوام و قبائل کی تقسیم کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ باہمی تعارف کے لئے اس کا استعمال اس تقسیم کا قدرتی استعمال ہے لیکن اس کو قومی نخوت، قبائلی برتری اور دوسرون کی پستی، اور ہیچ میرزی کا ذریعہ بنا لینا اس کا غیر فطری استعمال ہے،

گیا، اور اُن کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنا لیا گیا،

کچھ بھی ہو، اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں مروانیوں کی یہ حکومت خود ہی جل بھُن کر ختم ہوگئی، انہیں کچھ لوگوں میں ہشام بن عبد الملک کا ایک پوتا گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اندلس تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا، مروانیوں کی قبضہ گیر فوج اندلس پر اپنے اقتدار کو اب تک قائم کئے ہوئے تھی، کہتے ہیں کہ حضرت عمرؒ ابن عبد العزیزؒ نے اندلس سے واپسی کا جو حکم مسلمانوں کو دیا تھا، اور واپسی کا کام شروع بھی ہوگیا تھا، لیکن ان ہی فوجیوں کے عرض و معروض پر اپنے حکم کو آپ نے ملتوی فرما دیا، اور یوں ان فوجیوں کو یہاں ٹھہر جانے کا موقعہ مل گیا تھا، یہ قبضہ گیر فوج شام کی چھاؤنیوں سے اندلس بھیجی گئی تھی، اس لئے اس کو سرزمین اندلس سے مانوس کرنے کے لئے وہی نام ان آبادیوں کے اُن کی رعایت سے اندلس میں رکھ دیئے تھے، جو شامی چھاؤنیوں کے تھے، مروانی حکومت کے سارے زہریلے جراثیم ان فوجیوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور مروانیوں کے آخری دور میں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۵) قوم و اقوام کی باہمی تعریف کے اسباب ہیں، بڑا تاریخی سبب یہی غلط استعمال ہو گیا ہے آگے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے) حاصل جس کا وہی ہے کہ برتری و فضیلت کا معیار ذات نہیں، بلکہ صفات ہیں، ذات کچھ بھی ہو، عربی ہو، یا عجمی لیکن خدا کے یہاں وہی شریف ٹھہرایا جائے گا، جو اپنی سیرت و کردار میں خدا کے نشان زدہ حدود میں ٹھہرا ہوا ہے، وہ تقویٰ کی زندگی گذارتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے استدلال کرنے والوں کا نام شعوب کے لفظ کی وجہ سے شعوبیہ رکھ دیا گیا تھا، اگر یہی واقعہ ہے تو ان مسلمانوں کی یہ بڑی دیدہ دلیری تھی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شعوبیہ کے مقابلہ میں عربوں کی نسلی برتری ثابت کرنے کے لئے کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں، عقد الفرید میں ابن قتیبہ مشہور مصنف کی ایک کتاب کا اسی سلسلہ میں تذکرہ کرتے ہوئے یہ عجیب لطیفہ لکھا ہے، کہ نقض فی آخرہ کل ما بنی فی اولہ (عقد ج ۲) یعنی سارے انسانوں کے مقابلہ میں عربی نسل کی برتری کو جن دلائل سے ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ثابت کیا تھا، آخر میں خود ہی سب کی تردید کر دی، اور یہ نہ کرتے تو اور کرتے کیا، ۱۲

عربیت بھی نزاریت اور یمنیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، اندلس کی قبضہ گیر فوج اس تقسیم کے اثر سے بھی متاثر ہوئی اور بری طرح متاثر ہوئی، کامل ابن اثیر میں لکھا ہے کہ نزاری اور یمنی عربوں میں جو جھگڑے اندلس میں آئے دن ہوتے رہتے تھے بعض دفعہ اُن کی کشمکش اس نوبت کو پہنچ جاتی تھی کہ

اقتتلوا بالرماح حتى تقطعت و	(نزاری عرب اور یمنی عرب) پہلے تو نیزوں
بالسیوف حتى تكسرت ثم تجاذبوا	سے لڑے تا آنکہ سب ٹوٹ پھوٹ گئے،
بالشعور،	تو تلواریں چلیں، اور وہ ٹوٹ کر ختم ہوگئیں
(ج ۵ ص ۱۸۳)	آخر میں ایک دوسرے کے بال کو پکڑ کر کھینچنے لگے

خانہ جنگی کی اتنی بدترین شکل کے باوجود بھی اندلس کی کوہستانی اور پتھریلی زمین کو چھوڑنے پر یہ فوج آمادہ نہ ہوئی، وہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اس جزیرہ نما سے نکلنا نہ چاہیے، ان جھگڑوں کے چکانے کی آخر میں یہ عجیب و غریب صورت ان فوجیوں نے یہ اختیار کی، کہ

"ایک سال نزاری عرب کی پارٹی کا آدمی اندلس کی مسلمان فوجیوں کا امیر رہے، اور دوسرے سال امارت کا یہ عہدہ یمنی عربوں کے کسی آدمی کے سپرد بخوشی و رضامندی کر دیا جائے"

(ج ۵ ص ۱۸۳)

گویا اندلس میں قیام کی خواہش اور حد سے گذرے ہوئے شوق نے ایک خاص قسم کی جمہوریت پر اُن کو راضی کر دیا تھا،

ان فوجیوں کی یہ خوش قسمتی تھی، کہ اس عرصہ میں مروانی حکومت کا ایک شاہزادہ یعنی ہشام کا پوتا عبد الرحمن اندلس پہونچا، سالانہ امارت کے اس پھیر کے قصوں سے لوگوں کو یہ زیادہ آسان نظر آیا کہ عبد الرحمن ہی کو اپنا امیر بنا لیا جائے، اس میں کچھ اختلافات بھی ہوئے لیکن فوجیوں کی اکثریت عبد الرحمن کے ساتھ تھی، اس لئے اختلافات ختم ہوگئے، اور عبد الرحمن جو بعد کو الداخل کے لقب سے تاریخ میں مشہور ہوا، اندلس کا باضابطہ حکمران

بن گیا، ظاہر ہے کہ اس بیچارے کی پرورش ہی مروانی ماحول مین ہوئی تھی، اس لئے اپنے خاندانی روایات اور موروثی خیالات وجذبات سے الگ ہونکی اس کے لئے شکل ہی کیا تھی، قرطبہ مین داخل ہوتے ہوئے جو شعر اس نے پڑھا تھا، اب بھی تاریخون مین نقل کیا جاتا ہے،[1] جس کا حاصل یہ ہو کہ عباسیہ جو عجمی نہین عربی تھے، اُن کی حکومت بھی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، گویا تنگ ہوتے ہوتے اس غریب کا حوصلہ اتنا مختصر ہو کر رہ گیا تھا کہ مروانیون کے سوا کسی دوسرے عربی خاندان کی حکومت کی بھی گنجایش اس کے اندر باقی نہ رہی تھی، اور انسانیت سے ہٹ کر جو تعمیر بھی کی جائے گی، اس کا آخری انجام بہرحال یہی ہو کر رہے گا،

عبدالرحمن کو مرکز بنا کر جزیرہ نما کے منتشر مسلمانون کو منظم ہونے کا موقعہ جب ملا تو اندلس ان لوگون کی بھی پناہ گاہ بن گیا، جو عباسیون کی حکومت کے زیر اثر رہنا نہیں چاہتے تھے، ایسے پناہ گزینون کی ٹولیان وقتاً فوقتاً عبدالرحمن کے پاس پناہ لینے کے لئے اندلس آتی رہتی تھین، اُن کے نفسیات، جذبات وعواطف کا اندازہ اس مشہور اندلسی پناہ گزین سے ہوتا ہے، جو نسلاً مروانی خاندان کا تھا، نام اس کا عبدالملک بن عمر تھا، کہتے ہین کہ عبدالرحمن نے شروع مین امیر ہو جانے کے بعد بھی رسمی طور پر خطبہ مین عباسیون کے خلیفہ کے نام کو باقی رکھا تھا، لیکن عبدالملک جب اندلس پہنچا، تو اُس نے اصرار شروع کیا کہ خطبہ سے عباسی خلیفہ کا نام نکال دیا جائے،

والا قتلت نفسی؛ (کامل ج ۵ ص ۴)

ورنہ مین اپنے آپ کو قتل کر دون گا،

عبدالملک، عبدالرحمن کے خاص عزیزون مین تھا، اس لئے عبدالرحمن، اس قتل کی دھمکی سے متاثر ہو گیا اور رسمی نام بھی خطبہ سے عباسیون کا نکال دیا گیا، دنیا طلبی کا جو بھوت اس عبدالملک پر سوار تھا، اس کی

---

[1] اصل شعر یہ ہے: وکنا نسوس الناس والامر امرنا
اذا نحن فیھم سوقۃ نتنصف
یعنی ہم ہی لوگون پر حکومت کرتے تھے، اور حکم صرف ہمارا حکم تھا، اچانک ہم ان لوگون مین شریک ہو گئے، جن پر دوسرے حکومت کرتے ہین، اور دوسرون سے اپنا انصاف کراتے ہین (ج ۵ ص ۱۰۸ کامل)

گندگی اور سیاہی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک موقعہ پر جب اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی راہ کا کانٹا نہ بن جائے، تو بغیر کسی دغدغہ کے

"بیٹے کی گردن بھی اڑا دی، اس کی بھی، اس کے سارے گھر کے لوگون کی بھی، اور اس کے تمام خانگی ملازمون کی بھی"۔ (ج ۵ ص ۳ کامل)

الغرض عبدالرحمن الداخل سے پہلے اندلس مین جو قبضہ گیر فوج تھی، اس کا اور خود عبدالرحمن کا اور عبدالرحمن کی امارت قائم ہونے کے بعد ادھر اُدھر سے اس کے پاس جو مسلمان عباسیون کی حکومت سے نکل نکل کر پناہ گزین ہو رہے تھے، ان سب کی نفسیاتی کیفیت کے اندازے کے لئے غالباً تاریخ کی مذکورہ بالا شہادتین کافی ہین،

سچی بات تو یہ ہے کہ اندلس کے اس جزیرہ نما مین مسلمانون نے اچھے اور برے حالات کے ساتھ تقریباً آٹھ صدیان گذارین، یعنی ۹۲ھ مین اندلس فتح ہوا، اور کامل تخلیہ اس ملک کا مسلمانون نے ۸۹۷ھ مین کیا، ان آٹھ صدیون مین مروانیون کی یہ حکومت جو عبدالرحمن الداخل کے زمانہ مین قائم ہوئی، مرکزی حیثیت سے سارے اندلس پر اس کا اقتدار کم و بیش ڈیڑھ سو، دو سو سال سے زیادہ صحیح معنون مین قائم نہیں رہا، اس خاندان کا آخری واقعی حکمران حکم بن ہشام تھا، جس کا انتقال ۳۶۳ھ مین ہوا، اسی کے بعد حکم کا بیٹا ہشام المؤید باللہ کے نام سے تخت نشین تو ضرور ہوا، لیکن اس بیچارے کی ساری عمر حرم سرا کے اندر بطور ایک اسیر یا قیدی کی گذری، تفصیلات کے لئے تاریخ کی مبسوط کتابون کا مطالعہ کیجئے،

مین جو کچھ کہنا چاہتا ہون وہ یہ ہو کہ اندلس کی اس مروانی حکومت کے حکمرانون کے جو حالات ہماری کتابون مین لکھے گئے ہین، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی چال ڈھال سیرت و کردار مین اُن کی کیفیت بھی تقریباً وہی تھی، جو دمشق کے مروانی حکمرانون کی تھی، یعنی سیاسی اغراض کے سامنے اسلامی مطالبات کی پروا جیسے دمشق کے مروانی خلفاء نہین کرتے تھے، اور مسلمانون سے جزیہ کے ٹیکس کے وصول کرنے پر اُن کا اصرار اس حد تک بڑھا ہوا تھا، کہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ممانعت کے باوجود پھر اسی مردہ جاہلی رسم کو زندہ کیا گیا، کچھ یہی نقطہ نظر

انھون نے بھی محض سیاسی مصالح کی بنیاد پر حج جیسے اسلامی رکن کے ادا کرنے سے اندلس کے مسلمانون کو محروم کر رکھا تھا خصوصًا جن بے چارون کا حکومت سے کوئی تعلق ہوتا، ابن خلدون کے الفاظ مین کہ

کان بنو امیة بالاندلس یمنعون اهل دولتهم من السفر لفریضة الحج، (مقدمہ ص ۲۲۰)	بنی امیہ کے اندلسی حکمران اپنی حکومت کے لوگون فریضۂ حج کے ادا کرنے سے روکتے تھے،

یہ بھی لکھا ہے کہ

فلم یحج لسائرایا مهم احد من اهل دولتهم (مقدمہ ص ۲۲۰)	جب موانیون کی حکومت اندلس مین رہی اُن کی حکومت سے تعلق رکھنے والون مین سے کسی نے حج نہین کیا،

مگر اسی کے ساتھ جوامع اور مساجد کے بنانے کا شوق و ذوق بھی ان پر اسی طرح غالب تھا، جیسا کہ دمشق کے مروانی خلفاء کا تھا، جامع اموی اس وقت تک دمشق مین اُن کی یادگار باقی ہے، جسے لوگ دنیا کے چند خاص عجائبات مین شمار کرتے ہین، لیکن اس تعمیری ذوق کی تہ مین جو جذبہ کار فرما تھا، اس کا اندازہ اس قسم کے واقعات سے ہوتا ہے.

دمشق کے مروانی خلفاء مین ہشام بن عبدالملک بڑے کلّے ٹھّرے کا حکمران گذرا ہے، ابن عساکر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینۂ منورہ، مکۂ معظمہ کوفہ بصرہ کے لوگ

اس کے پاس آئے تھے، اُس نے حکم دیا کہ دمشق کے باہر قصور و محلات اور جو عمارتین بنوائی گئی ہین، اور نہرون کو پہنچا کر جو باغات ان عمارتون مین تیار کئے گئے ہین اُن کو آراستہ پیراستہ کیا جائے، پھر اپنے ساتھ مذکورۂ بالا مقامات پر مسلمانون کو لے کر پہنچا، اور لوگون سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اے مکہ والو! کیا تمھارے یہان ایسی عمارتین ایسی سیرگاہین! ایسے سرسبز و شاداب باغات ہین، جب وہ بے چارے کہتے کہ نہین، امیرالمؤمنین ہمارے یہان یہ چیزین کہان ہین، تو دل ہی دل مین خوش ہوتا،[۱]

---

[۱] ابن عساکر کی تاریخ دمشق ج ۵ ص ۵۰،

بجنسہٖ یہی رنگ اندلس کے مروانی حکمرانون کا بھی نظر آتا ہے، مشہور ہے کہ اندلس کا تاریخی قصر الزہرا جو عبدالرحمن الناصر کے حکم سے تیار ہوا تھا، جب وہ پہلی مرتبہ اپنے حوالی موالی کے ساتھ اس قصر مین داخل ہوا، تو لوگون سے خطاب کر کے پوچھا،

هل بلغکم ان احدا بنی مثل هذا البناء، (کامل ج ۸ ص ۲۲۳)	کیا تم جانتے ہو کہ کسی نے ایسا محل کبھی بنایا تھا،

درباریون نے عرض کیا،

"نہین سرکار، نہ ایسی عمارت دیکھنے ہی مین آئی اور نہ سننے مین"،

عبدالرحمن اس جواب کو سُن کر بہت مسرور ہوا،[۱]

اور یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانون کے عہد مین اندلس کی ساری علمی سرگرمیان جن کی بدولت دینی علوم مین ابن حزم و ابن عبدالبر جیسے ارباب تحقیق پیدا ہوئے، اور ابن باجہ، ابن رشد، ابن طفیل، ابن زہر وغیرہم جیسی غیر معمولی

---

[۱] مشہور ہے کہ درباریون مین صرف ایک قاضی منذر البلوطی تھے جنھون نے اس چھچھورے پن اور کوتاہ نظری پر عبدالرحمن کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ تمھارے ساتھ شیطان بازی گری کر رہا ہے، پھر قرآن کی مشہور آیت یاد دلائی، جس کا حاصل یہی ہے کہ نا عاقبت اندیشی کی عام کمزوری جو انسانی فطرت مین پائی جاتی ہے، قدرت صرف اس کی رعایت کر رہی ہے، ورنہ اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے دنیا اور دنیا کی زندگی اتنی بے قیمت ہے کہ اللہ اور رسول کے منکرون کے مکانات اُن کی چھتین، اُن کی زینے، سب ہی چاندی سونے کے بنا دیئے جاتے "دیکھئے، قرآن کی سورۂ زخرف کی آیت لولا ان یکون الناس امة واحدة الخ" اس موقع پر اس دلچسپ لطیفہ کا خیال آتا ہے کہ یہی عبدالرحمن الناصر قصر الزہرا کا بانی و معمار جس مین بقول المقری پندرہ ہزار سے زیادہ بڑے او چھوٹے کیواڑ استعمال کئے گئے تھے، ستونون کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی، کہتے ہین کہ عبدالرحمن کی ایک ڈائری مرنے کے بعد ملی تھی، جس مین لکھا تھا کہ اپنی حکمرانی کی پوری مدت (پچاس سال) مین صرف چودہ دن مجھ پر ایسے گذرے ہین، جن مین کہہ سکتا ہون کہ غم و الم فکر و تردد کے کانٹون سے

ہستیاں عقلی علوم مین پیدا ہوئین، ان بزرگون کے حالات اور سنینِ ولادت و وفات کو اٹھا کر دیکھئے تو واضح ہوگا
کہ عموماً اس قسم کے افراد اندلس مین مروانیون کی مرکزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد ہی پیدا ہوئے، مروانی
حکمرانون کے زمانہ مین دین کی حد تک بجز معدودے چند حضرات کے جو گو پیدا ہوئے تھے اندلس مین لیکن ان کی
تعلیم و تربیت بالکلیہ اسلام کے مشرقی شہرون مین ہوئی تھی، مثلاً بقی بن مخلد وغیرہ، ورنہ ان کے سوا زیادہ تر
وہی تو آضحہ اور العتبیہ مالکی فقہ کے متون کے مصنفین ہمین مروانی عہد مین نظر آتے ہین، کیونکہ حکومت کی عدالت
کا محکمہ مالکی مذہب کے مولویون کے ہاتھ مین تھا، اور علاج معالجہ کے سلسلہ مین کچھ ایسے اطبا بھی ملتے ہین، جو
عقلی علوم و فنون سے بھی تعلق رکھتے تھے، لیکن قدر و منزلت اُن کی صرف طبیب ہی ہونے کی وجہ سے تھی، الغرض
فقہ مالکی اور قدرے طبی علوم کے سوا سارا زور وہی عرب کے جاہلی دور کے قصون کہانیون پر مرکوز تھا،

ہماری تاریخون مین بھی اور غیرون نے بھی اندلس کے اس کتب خانے کا بڑے شاندار الفاظ مین تذکرہ کیا ہے،
جو حکم ثانی نے قائم کیا تھا، یورپ کے مورخین تو حسب عادت طلسمی اعداد و شمار کے ساتھ اس کتب خانے کا ذکر
کرتے ہین، ہمارے مورخین بھی یہ خبر دیتے ہوئے کہ

کان محبًا للعلم مشغوفًا بجمع الکتب	حکم علم کا رسیا تھا کہ اور اس کو کتابون کے جمع
والنظر فیها،	کرنے اور اُن کو مطالعہ کا سودا حد سے بڑھا ہوا تھا،

ان الفاظ مین اس کے اس مشہور کتب خانے کا ذکر کرتے ہین،

انه جمع منها مالم یجمعه احد قبله	اس نے اتنی کتابین جمع کی تھین کہ نہ اس سے
ولا جمعه احد بعده حتی ضاقت	پہلے کسی نے اتنی کتابین اکٹھی کی تھین، نہ اس
خزائنه، (شذرات جلد ۳ ص ۵۶)	کے بعد کتابون کی اتنی بڑی مقدار اس کے پاس

کہ اس کے خزانے تنگ ہو گئے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۱) پاکہ تھے، شذرات الذہب ج ۳ ص ۵ بحوالہ المقری یہی خود اعترافی شہادت قاضی البلوطی کی
کی تنبیہ کے لئے کافی ہے،

ابن اثیر نے تو جماع لکتب کے لقب ہی سے اس کو ملقب کیا ہے، لیکن ان ہی مورخین کی زبانی ہم جب
یہ سنتے ہین کہ

کان بصیرا بالادب والشعر وایام	الحکم ادب عربی کا ماہر تھا، عربی شعر اور ایام
الناس وانساب العرب،	جاہلیت کی تاریخ عرب کے قبائلی رشتون
(ج ۳ ص ۵۶)	کا بڑا واقف کار تھا،

تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے کتب خانہ مین کن علوم و فنون کی کتابین زیادہ جمع ہوئی ہون گی،
گویا یون سمجھنا چاہئے کہ عقد الفرید ابن عبدربہ کی کتاب کے معلومات اس زمانہ کے مروجہ علوم و فنون کی فہرست
ہین یعنی اپنے دمشقی مورثون سے جو چیزین اندلس کے مروانی حکمرانون تک پہنچی تھین، ان ہی کو آگے
بڑھانے اور چمکانے مین وہ زیادہ مشغول رہے، ان عربی مسلمانون کو اپنی عربیت پر ناز تھا، اور اسی کو
انھون نے دمشق مین بھی نمایان کیا تھا، اس لئے اندلس پر جب تک ان کا اقتدار قائم رہا، تو عربیت ہی
کے لئے جگہ پیدا کرنے اور اسی کی تمکین فی الارض مین وہ کوشش کرتے رہے تھے،

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اندلس کے عربی النسل مسلمان تو خیر عربی النسل ہی تھے، بعض لوگ جو خالص
عربی النسل نہین تھے، بلکہ اندلس کی یورپین نسلون سے جن کا تعلق تھا، انھون نے بھی اسلام قبول کرنے
کے بعد بجائے اسلام کے دینی علوم کے ان ہی علوم مین کمال اور امتیاز مروانی عہد مین پیدا کیا جن کا تعلق
خالص عربیت سے تھا، ابن القوطیہ اندلس کے مشہور ادیب، اور عربی لغت کے محققین مین شمار ہوتے ہین،
شذرات مین اُن کے امتیازی کمالات کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے،

کان راسًا فی اللغة والنحو حافظًا للاخبار	لغت و نحو کے امام، (عرب جاہلی) کے حالات
وایام الناس، (ص ۶۲)	اور ایام عرب کے حافظ تھے،

بہر حال ابن القوطیہ ادب عربی کے اندلسی ائمہ مین شمار ہوتے ہین، اُن کے نسب نامہ کو بیان کرتے ہوئے ذہبی

مورخین نے لکھا ہے کہ اُن کے خاندان کا تعلق

من ملوک القوط بالاندلس،	اندلس کے اس شاہی خانوادہ سے تھا، جو
(شذرات جلد ۳ صفحہ ۶۲)	قوطہ[1] کے نام سے موسوم تھے،

تھا، اور اسی سے سمجھ مین آتا ہے کہ نسلاً بھی یہ شخص یورپین ہی تھا، ایک طرف وہ عربیت کے امام تھے، اور دوسری طرف لکھا ہے کہ

ولم یکن بالضابط للروایۃ فی الحدیث والفقہ، (ص ۶۲)	مگر حدیث و فقہ کی روایت مین وہ محتاط نہ تھے،

ابن خلکان کا بیان ہے کہ درازی عمر کی وجہ سے صرف سند کو عالی کرنے کے لئے فقہ و حدیث کے روایات بھی ابن قوطیہ سے لوگ سُن لیا کرتے تھے،

کچھ بھی ہو اس سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانون سے پہلے اندلس مین جو لوگ آباد تھے، وہ رہن سہن اور خورش و پوشش کے طریقون مین مسلمانون سے کافی متاثر ہوئے تھے، لیکن جس دین کی تمکین کے لئے مسلمانون کو حکومت ملی تھی کیا اس کو بھی اپنے دائرہ کے وسیع کرنے کا موقعہ اندلس یا اندلس کے سوا آس پاس کے دوسرے سرحدی یورپین علاقون میں ملا تھا؟ واقعات و مشاہدات کے سوا تاریخی شہادتون کی زبانین بھی اس سوال کے جواب مین خاموش ہین، لے دے کر کچھ ابن قوطیہ وغیرہ نامون سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگون نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا، لیکن ان مین بھی اسلام سے زیادہ عربی کلچر ہی کا ذوق غالب تھا، مین

---

[1] قوطہ اصل مین گاتھ کے لفظ کی معرب شکل ہے مسلمانون سے پہلے گاتھ قوم ہی کے لوگ اندلس پر مسلط تھے، دیباج المذہب مین ابن فرحون نے بیان کیا ہے کہ قوطیہ درحقیقت اندلس کے گاتھ بادشاہ رازرق کے نواسے کی لڑکی تھی، اسلام قبول کر کے اندلس سے فریادی بن کر ہشام بن عبدالملک وقت کے حکمران کے پاس پہنچی، اس شاہزادی سے عیسیٰ بن مزاحم نے نکاح کر لیا تھا، (د ص ۲۶۲)

نہین کہہ سکتا کہ دوسرون کا خیال اس باب مین کیا ہے؟ لیکن میرے نزدیک تو مسلمان دنیا مین خاص وضع قطع کے لباسون، نشست و برخاست کے طریقون، تعمیری خصوصیتون، گانے بجانے اور رقص و سرود کے خاص خاص ڈھنگون، شادی و غمی کے مخصوص رسوم وغیرہ کی تبلیغ کے لئے قطعاً اٹھائے نہ گئے تھے، قدرت نے اُن کو ان لازوال ابدی صداقتون پر انسانیت کو اکٹھا کرنے کے لئے کھڑا کیا تھا، جو قومون مین پہلے سے جانی پہچانی جاتی تھین، قرآن کی اصطلاح مین جن کی تعبیر "المعروف" اور "المنکر" کے الفاظ سے کی گئی ہے، اور جن مین حالات و واقعات نے اشتباہ پیدا کر دیا تھا، اور جن پر شک اور ریب کے بادل چھا گئے تھے، ان ہی اشتباہی کیفیتون کا ازالہ کر کے "ایمان راسخ" پر بنی آدم کو کھڑا کر دینا یہی کام مسلمانون کا پہلے بھی تھا، اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا،

(باقی)

تاریخ اندلس

اندلس پر اردو مین بکثرت مضامین اور کتابین لکھی گئین، اور بکثرت عربی و انگریزی کتابون کا ترجمہ بھی کیا گیا، لیکن پھر بھی ایک محققانہ اور مستند کتاب کی ضرورت باقی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جو درحقیقت دار المصنفین کے پیش نظر سلسلۂ تاریخ اسلام کی ایک اہم کڑی ہے، اس کی متعدد جلدین ہین، جو بتدریج شائع ہون گی، اس جلد مین شروع مین اندلس کے طبعی و تاریخی جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ وہان کے باشندون اور مختلف حکومتون کی تفصیل، پھر اندلس پر مسلمانون کے حملون، اور ان کے فتوحات کا بیان ہے، پھر فاتح اندلس طارق ابن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) ۹۳ھ (۷۱۲ء) سے لے کر عبدالرحمن اوسط ۲۱۶ھ (۲۳۸ء) تک وہان کی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ قلمبند ہے، (مرتبہ مولانا ریاست علی ندوی)

قیمت :- عمر

"منیجر"

سفرنامۂ امام شافعی پر ایک نظر

از

از حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

تذکرہ و ادب کی متعدد کتابون مین امام شافعیؒ کا ایک خود نوشت سفرنامہ ملتا ہے، اس سفرنامہ کی صحت و عدم صحت کے بارے مین قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے، بعض تذکرہ نویسون نے اس کو صحیح سمجھ کر من و عن اپنی کتابون مین نقل کر دیا ہے اور بعض نے یا تو سرے سے اس کو نقل ہی نہیں کیا ہے، یا اگر نقل کیا ہے تو اس کے متن و سند پر جرح و تنقید کی ہے،

ابھی چند دن ہوئے علامہ ابن عبد البر کی مشہور و مقبول کتاب "جامع بیان العلم و فضلہ" کا اردو ترجمہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے، کتاب کے مترجم مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی مین، خوش مذاق مترجم نے کتاب کے آخر مین امام شافعیؒ کے مذکورہ سفرنامہ کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے، صدق جدید مین اس کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس سفرنامہ کی صحت کے بارے مین ایک ہلکے سے شبہ کا اظہار کر دیا تھا جن کی تائید بعد مین مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے بھی کی، مولانا ظفر احمد صاحب نے تو اس سلسلہ مین امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر کی رائین بھی نقل کر دی تھین جس سے اس کی صحت بڑی حد تک مشکوک ہو جاتی ہے مگر اب بھی یہ بحث کچھ تشنۂ تحقیق معلوم ہوتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ مین کچھ مزید باتین پیش کر دی جائین تاکہ اہل علم اس کی صحت و عدم صحت کے بارے مین کسی صحیح فیصلہ پر پہنچ سکین،

جن ارباب تذکرہ اور اہل علم نے اس سفرنامہ کو اپنی کتابون مین جگہ دی ہے ان مین امام بیہقیؒ، امام رازیؒ اور امام سیوطیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہین، اتفاق سے یہ تینون بزرگ شافعی مسلک رکھتے ہین، اور شافعیت مین اُن کو ایک حد تک غلو بھی ہے، اس لئے ان روایات کے سلسلہ مین جنکا تعلق امام شافعی کے مسلک یا ان کی ذات سے ہو، یہ حضرات بحث و تمحیص اور تدقیق و تحقیق سے کم کام لیتے ہین، خصوصیت سے امام سیوطی کے بارے مین تو حاطب اللیل (یعنی ہر طرح کی رطب و یابس روایات کے جامع) کا جملہ مشہور ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامہ کو انھون نے اپنی کتابون مین جگہ دے دی اور اس کے متن اور سند پر کسی جرح و تنقید کی ضرورت محسوس نہین کی، بخلاف اس کے محقق شافعی اہل علم یا اہلِ تذکرہ نے اسکے متن پر بھی تنقید کی ہے، اور راویون کی بھی پردہ دری کی ہے،

اس سفرنامہ کے موضوع اور جعلی ہونے پر متعدد داخلی اور خارجی شہادتین موجود ہین، جن کو مختصر طور سے پیش کیا جائے گا، خارجی شہادت سے میری مراد یہ ہے کہ یہ سفرنامہ جن رواۃ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اُن کے بارے مین محدثین نے اچھی رائے قائم نہین کی ہے، اور داخلی شہادت سے مراد یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب، تاریخ و سنین کی تعیین کے اعتبار سے اس سفرنامہ مین بعض ایسی خامیان ہین کہ اگر اُن کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے مسلم واقعات غلط قرار پا جاتے ہین،

خارجی اسقام اس سفرنامہ کے مرتب دو شخص ہین، ایک عبد اللہ بن محمد البلوی، دوسرے عبد الرزاق حمران البطین، ان مین عبد اللہ بن محمد البلوی کا ذکر تذکرہ و رجال کی کتابون مین ملتا ہے، مگر اس کے غیر ثقہ اور وضاعِ حدیث ہونے پر تمام اربابِ رجال متفق ہین، امام ذہبی لکھتے ہین :-

قال الدارقطنی یضع الحدیث روی عنہ ابو عوانۃ فی صحیحہ فی الاستسقاء خبراً موضوعاً (میزان الاعتدال ج ۲ ص ...)

دارقطنی کا قول ہے کہ یہ حدیثین وضع کرتا تھا، اس سے ابو عوانہ نے استسقاء کے سلسلہ مین ایک موضوع حدیث روایت کی ہے،

حافظ ابن حجر نے بھی لسان المیزان مین دارقطنی کا مذکورہ قول نقل کیا ہے، پھر توالی التاسیس مین اس سفرنامہ پر تفصیل سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے، ان کی پوری عبارت ہم آگے نقل کرین گے،

عبد اللہ بن محمد البلوی نام کے ایک شخص کا ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے مگر اس پر کوئی تنقید نہین کی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ منصب ابن ندیم کا نہین ہے، ابن ندیم ہی کے حوالہ سے اسی بلوی کا ذکر ایک شیعی مصنف یعنی صاحب منتہی المقال نے بھی کیا ہے، اور اس کے بارے مین لکھا ہے کہ وہ واضع حدیث تھا، اگر یہ وہی بلوی ہے تو اس کے غیر ثقہ اور وضاع حدیث ہونے مین اب کس کو شبہ ہو سکتا ہے، ابن ندیم نے اس کے تذکرہ مین لکھا ہے کہ یہ واعظ تھا جو اس کے ضعیف بلکہ وضاع ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس لئے کہ واعظون کا یہ خاص پیشہ تھا کہ وہ زیب داستان کے لئے واقعات کو بڑھا چڑھا کر رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اپنے خط مین لکھا تھا کہ حافظ ابن قیم نے بھی مفتاح دار السعادہ مین اس پر کچھ لکھا ہے، مین نے وہ عبارت تلاش کی، مگر افسوس ہے کہ نہ مل سکی، اگر مولانا اس کی نشاندہی کر دیتے تو بہتر تھا،

یہ تو پہلے راوی کا حال تھا، دوسرے راوی حمران البطین اور اس کے نیچے کے راوی احمد بن محمد الکوفی دونون مجہول ہین، ان مین سے کسی ایک کا تذکرہ بھی رجال و طبقات یا تاریخ و تذکرہ کی متداول کتابون مین نہین ملتا، اُن کے نیچے کے راوی احمد بن الفارسی کا حال بھی یہی ہے،

اس سفرنامہ کے اصل راوی امام شافعیؒ کے شاگرد ربیع بن سلیمان[1] جیزی ہین، ان سے ابن منذر نے روایت کی ہے، لیکن اور کوان کے بارے مین تو ہم لاعلم تھے ہی، ابن منذر کے حالات بھی تلاش و جستجو سے متداول

[1] اس نام کے دو آدمی امام شافعی کے تلامذہ مین ہین، صرف دونون کی خاندانی نسبت مین فرق ہے، ایک ربیع جیزی اور دوسرے ربیع مرادی کی نسبت سے مشہور ہین، آخر الذکر امام شافعی کے خاص شاگردون مین ہین اُن کی بیشتر کتابون کے راوی یہی ہین، اور اول الذکر جو اس سفرنامہ کے راوی ہین ان کو تلمذ کے علاوہ کوئی خاص خصوصیت حاصل نہین ہے،

کتابون مین نہ مل سکے حتی کہ ربیع کے تلامذہ مین بھی ان کا نام نہین ملتا، علامہ زاہد الکوثری کے بیان سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کے کوئی راوی ضرور تھے، مگر ان کے بارے مین انھون نے عقیلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابن منذر کو ربیع مرادی سے سماع حاصل نہین ہے، ظاہر ہے کہ ربیع مرادی سے جن کا انتقال ۲۷۰ھ مین ہوا، ان کو سماع نہین ہے تو پھر ربیع جیزی کی ان کی روایت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے، جب کہ اُن کا انتقال ۲۵۶ھ مین ہو چکا تھا،

داخلی استقام | یہ تو اس سفرنامہ کے سلسلۂ سند کا حال ہے، اس مین تاریخی و درایتی خامیان بھی ہین، اس سلسلہ مین پہلے چند محقق تذکرہ نگارون کے بیانات پیش کئے جاتے ہین،

حافظ ابن عبد البر، حافظ ابن کثیر، خطیب بغدادی، امام ذہبی، امام نووی وغیرہ نے امام شافعی کے حالات لکھے ہین، مگر ان مین سے کسی نے اس سفرنامہ کا ذکر نہین کیا ہے، امام نووی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ان کا سفر مدینہ بہت مشہور ہے، اور اس کو کسی نے مرتب بھی کر دیا ہے، امام ابن تیمیہ نے اصل سفرنامہ پر تو کچھ نہین لکھا ہے، مگر اس کے ایک جزء پر تنقید کی ہے، یعنی یہ کہ امام ابو یوسف سے امام شافعی کی ملاقات ثابت نہین ہے، اور اس سفرنامہ سے دونون کی ملاقات اور مناظرہ کا پتہ چلتا ہے، حافظ ابن حجر پہلے شخص ہین جنھون نے اس سفرنامہ پر کھل کر تنقید کی ہے، لسان المیزان مین بلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

هو صاحب رحلة الشافعی طولها	اسی نے امام شافعی کا سفرنامہ بڑی طوالت
ونمقها وغالب ما اورد فيها	اور رنگ آمیزی کے ساتھ مرتب کیا ہے جس کا
مختلق، (ج ۳ ص ۳۳۸)	بیشتر حصہ من گھڑت ہے،

پھر توالی التاسیس[1] مین امام محمد اور امام شافعی کے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین،

[1] حافظ ابن حجر نے یہ کتاب امام شافعی کے حالات مین لکھی ہے، ان کے حالات مین یہ بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے،

واما الرحلة المنسوبة الى الشافعي المروية من طريق عبد الله بن محمد البلوى فقد اخرجها الآبري والبيهقي وغيرهما مطولة ومختصرة وساقها الفخر الرازي في مناقب الشافعي بغير اسنادٍ معتمداً عليها وهي مكذوبة وغالب ما فيها موضوع وبعضها ملفق من روايات ملفقة (ص ۱۷)

وہ سفرنامہ جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے جس کا راوی عبد اللہ بن محمد البلوی ہے، اس کو امام بیہقی، آبری وغیرہ میں سے کسی نے مختصراً اور کسی نے مطول نقل کیا ہی، اور امام رازی نے اس کو مناقب الشافعی مین بغیر کسی سند کے اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کیا ہے، حالانکہ یہ سفرنامہ بالکل جھوٹا ہے، اس کا بیشتر حصہ تو بالکل موضوع ہی، اور اس کے بعض حصے بعض مشتبہ روایات کی وجہ سے مشتبہ ہو گئے ہین،

اربابِ تذکرہ کے ان بیانات سے اجمالی طور پر یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سفرنامہ بالکل جعلی ہے مگر تفصیل کے لئے اس کے چند اور داخلی اسقام کی طرف اشارہ کیا جاتا ہی،

اس سفرنامہ مین جو سب سے پہلی بات تاریخی حیثیت سے غلط ہے، وہ یہ ہے کہ امام شافعی جس زمانہ مین امام مالک کی خدمت مین موجود تھے، اسی زمانہ مین مصر کے تشنگانِ علم کا ایک قافلہ امام مالک کے پاس سماعِ موطا کے لئے آیا جن مین عبد اللہ بن حکم، اشہب، ابن قاسم اور لیث بن سعد جیسے ائمہ تھے، اور امام شافعی نے ان ائمہ کو موطا کا املا کرایا، سفرنامہ کی اصل عبارت یہ ہے،

فامليته عليهم حفظاً منهم عبد الله بن حكم واشهب وابن القاسم قال الربيع واحسب انه ذكر الليث

مین نے اُن کو اپنے حفظ سے املا کرایا، ان مین عبد اللہ بن حکم، اشہب، ابن قاسم تھے، اور ربیع نے کہا کہ غالب گمان یہ ہے

بن سعد،

کہ انھون نے لیث بن سعد کا بھی تذکرہ کیا تھا،

اس عبارت کا ایک ایک لفظ غلط اور خلاف واقعہ ہے، سب سے پہلی خلاف قیاس بات اس مین یہ ہی کہ امام شافعی نے زبانی موطا کا املا کرایا، حالانکہ عام اہلِ مدینہ اور خصوصیت سے امام مالک کے طریقۂ درس سے جو لوگ واقف ہین، وہ اس کی کسی طرح تصدیق نہین کر سکتے، امام مالک درس کے معاملہ مین حد درجہ محتاط تھے، وہ اپنی روایات کو بھی جن کے وہ حافظ تھے، کبھی زبانی املا نہین کراتے تھے، بلکہ پہلے ان کو لکھ لیتے تھے، پھر مجلسِ درس مین پیش کرتے تھے، ظاہر ہے کہ جو شخص خود اپنی روایات کے بارے مین زبانی املا کو پسند نہ کرتا ہو، وہ امام شافعی جیسے کم سن شاگرد کو اس کی کیسے اجازت دے سکتا ہے،

اس کے علاوہ اس عبارت مین مصر کے جن اشخاص کو املا کرانے کا ذکر ہے، وہ تاریخی حیثیت سے صحیح نہین ہی، سب سے پہلے عبد اللہ بن حکم کو لیجئے ان کا سنہ ولادت ۱۵۵ھ ہے، اور امام شافعی مدینہ منورہ ۱۶۳ھ یا ۱۶۴ھ مین گئے تھے، اب اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ عبد اللہ بن حکم ۱۶۴ھ مین سماعِ موطا کے لئے مدینہ گئے، تو ان کی عمر زیادہ سے زیادہ نو برس کی تھی، ظاہر ہے کہ اس عمر مین ان کا مصر سے سیکڑون میل دور مدینہ جا کر موطا کا سماع کرنا عقل و بداہت کے بالکل خلاف ہو، اسی طرح ابن قاسم اور اشہب امام شافعی کی آمد سے بہت پہلے سے امام مالک کی خدمت مین موجود تھے، اس حالت مین یہ کہنا کہ یہ لوگ ان کی موجودگی مین مدینہ آئے کس طرح صحیح ہو سکتا ہی؟

سب سے زیادہ غلط بات لیث بن سعد کی موجودگی ہے، تمام اہلِ تذکرہ اس بات پر متفق ہین کہ امام شافعی اور لیث بن سعد مین ملاقات نہین ہوئی، جس کا امام شافعی کو زندگی بھر افسوس رہا، الرحمۃ الغیثیہ اور دوسرے تذکرون مین امام شافعی کا یہ قول منقول ہی کہ

ما فاتني احد فاسفت عليه ما اسفت على الليث

مجھے کسی شخص سے استفادہ نہ کرنے کا اس قدر افسوس نہین ہے جس قدر

بن سعد،

لیث بن سعد سے استفادہ نہ کرنے کا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کو لیث بن سعد سے نہ ملنے اور ان سے استفادہ نہ کرنے کا افسوس تھا، مگر سفرنامہ کی مذکورۂ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ لیث بن سعد سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور وہ بھی مفید کی حیثیت سے نہین، بلکہ مستفید کی حیثیت سے، حالانکہ اس وقت یعنی ۱۶۲ھ مین لیث بن سعد کی عمر ۶۰ برس سے زیادہ تھی، اور وہ مصر مین مرجع خلائق تھے،

اس سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کی خدمت مین آٹھ ماہ رہنے کے بعد امام شافعی مدینہ سے سیدھے عراق گئے، اس وقت اُن کی عمر ۱۴ سال کی تھی، یعنی ۱۶۲ھ مین عراق مین اُن کی امام محمد اور امام ابو یوسف سے ملاقات ہوئی، اور اُن سے بعض مسائل مین مناظرہ ہوا، بلوی کے بیان مین اتنا اور اضافہ ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے جب دیکھا کہ امام شافعی کا علمی وقار بڑھتا جا رہا ہے تو انھون نے ہارون رشید کو اُن کے قتل پر اکسایا،

تاریخ و روایت کے اعتبار سے اس بیان مین چند در چند غلطیان ہین۔

سب سے پہلی بات تو یہی غلط ہے کہ امام شافعی مدینہ سے سیدھے عراق گئے، اور اس وقت اُن کی عمر ۱۴ برس تھی، اُن کے بیشتر سوانح نگار لکھتے ہین کہ سماع موطا کے بعد وہ عراق نہین گئے، بلکہ ملازمت کے سلسلہ مین یمن چلے گئے، اور وہان سے یہ ایک سازش کے سلسلہ مین گرفتار کرکے ۱۸۴ھ مین عراق لائے گئے، اس سازش سے بری ہونے کے بعد وہ امام محمد کی خدمت مین آئے، اور اُن سے استفادہ کیا، اس وقت اُن کی عمر ۱۴ برس کی نہین بلکہ تیس برس سے زیادہ تھی، اور عراق مین پہلی بار اُن کا ورود عالم کی حیثیت سے نہین، بلکہ ایک متعلم کی حیثیت سے تھا، امام نووی لکھتے ہین،

كان للشافعي حين اتى مالكا ثلاث عشرة سنة ثم ولي باليمن.....

جس وقت امام شافعی امام مالک کی خدمت مین آئے، اُن کی عمر ۱۳ برس تھی، اُس کے

ثم رحل الى العراق[1]

بعد یہ یمن کے والی بنا دیئے گئے، پھر انھون نے عراق کا سفر کیا،

اس سے اتنا تو واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالک کی خدمت مین سماع موطا کے بعد وہ عراق نہین بلکہ یمن گئے، مگر اس سے سنہ کی تعیین نہیں ہوتی، اس کے لئے حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر کے بیانات ذیل مین درج کئے جاتے ہین، حافظ ابن کثیر لکھتے ہین،

انه ولي الحكم بنجران من الارض اليمن ثم تعصبوا عليه...... فحمل على بغل في قيد الى بغداد فدخلها في سنة اربع وثمانين ومائة وعمره ثلاثون سنة[2]

یہ نجران (یمن) کے والی بنا دیئے گئے تھے، وہین ان سے کچھ لوگون نے دشمنی کی، (اور ہارون سے شکایت کی) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قید کرکے بغداد بھیج دیئے گئے، اس طرح وہ بغداد پہلی بار ۱۸۴ھ مین گئے اور اسوقت انکی عمر تیس برس ہو چکی تھی،

حافظ ابن حجر نہایت وثوق کے ساتھ لکھتے ہین،

والذين تحرر لنا بالطرق الصحيحة ان قدوم الشافعي بغداد اول ما قدم كان سنة اربع وثمانين[3]

ہمارے نزدیک باوثوق ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ امام شافعی پہلی بار بغداد ۱۸۴ھ مین آئے،

ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام شافعی پہلی بار عراق ۱۶۲ھ مین نہین بلکہ ۱۸۴ھ مین گئے، اور اس وقت اُن کی عمر ۱۴، ۱۵ برس کی نہیں بلکہ تیس برس سے زیادہ تھی،

اب اس بیان کے دوسرے جزء پر نظر ڈالئے، وہ یہ کہ امام محمد اور امام ابو یوسف سے انھون نے مناظرہ کیا

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۴۸ ، [2] البدایہ ج ۱۰ ص ۲۵۱ ، [3] توالی التاسیس ص ۷۱

اور ان دونون بزرگون نے اُن کے قتل کی سازش کی،

اوپر امام شافعی کے ورود عراق کے سلسلہ مین جو ثبوت دیے گئے ہین، اُن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام شافعی ۱۸۴ھ سے پہلے کبھی عراق (بغداد) نہین گئے، اور تمام تذکرہ نگار متفقہ طور سے لکھتے ہین کہ امام ابو یوسف کا انتقال ۱۸۲ھ مین ہوا، ظاہر ہے کہ جب اُن کا انتقال اُن کی آمد عراق سے دو سو برس پہلے ہو چکا تھا، تو پھر اُن سے مناظرہ و مباحثہ اور سازش قتل کا الزام ایک بہتان کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

حافظ ابن حجر سفرنامہ کے اس جز پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

واوضح ما فیھا من الکذب قولہ	سب سے زیادہ جھوٹی بات اس سفرنامہ
فیھا ان ابا یوسف و محمد بن الحسن	مین یہ ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد نے
حرضا الرشید علی قتل الشافعی و	ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر اکسایا،
ھذا باطل من وجھین احدھما ان	یہ دو وجہون سے غلط ہے، ایک تو یہ کہ
ابا یوسف لما دخل الشافعی بغداد	جب امام شافعی بغداد گئے تو امام ابو یوسف کا
کان مات ولم یجتمع بہ الشافعی	انتقال ہو چکا تھا، اور امام شافعی کی ملاقات اُن کو نہین
والثانی انھما اتقی للہ من ان یسعیا	ہو سکی، دوسری یہ کہ یہ دونون بزرگ اس
فی قتل رجل مسلم لا سیما وقد	سے بلند اور خدا سے ڈرنے والے تھے کہ وہ
اشتھر بالعلم ولیس لہ الیھما	کسی مسلمان کے قتل کی کوشش کرتے،
ذنب الا الحسد علی ما آتاہ اللہ	خصوصیت سے یہ بات کہ امام شافعی
من العلم ھذا ما لا یظن بھما	کا علمی شہرہ ہو چکا تھا، اور اُن کا اس کے
وان منصبھما وجلالتھما و	علاوہ کوئی قصور نہین تھا کہ ان بزرگون
ما اشتھر من دینھما یصد	کو، اُن کے علمی تفوق کی وجہ سے حسد تھا،

عن ذالک،	ان بزرگون کے بارے مین ایسا گمان
	بھی نہین کیا جا سکتا، ان کا منصب انکی
(توالی صفحہ)	جلالت شان، اور ان کا دینی مقام خود

اس سلسلہ مین یہ بات بھی قابل غور ہے کہ امام محمد نے کبھی دربار خلافت سے تعلق نہین رکھا، بلکہ وہ تو امام ابو یوسف سے اسی لئے خفا ہو گئے تھے کہ انھون نے کوشش کر کے اُن کو رقہ کا قاضی مقرر کرا دیا تھا، ایسے شخص کے بارے مین یہ کہنا کہ خلیفہ کے یہان اپنا اعزاز و اکرام کو ختم ہوتے دیکھ کر امام شافعی کے قتل کی سازش کی اس سے زیادہ غلط بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

امام شافعی جب پہلی بار بغداد گئے تو وہ امام شافعی کی حیثیت سے نہین، بلکہ محمد بن ادریس کی حیثیت سے گئے تھے، اور امام محمد اور اُن مین جو علمی مذاکرے ہوئے وہ مذاکرے دو معاصرون کے نہین، بلکہ مفید اور مستفید کے درمیان تھے، عام تذکرہ نگارون کو جانے دیجئے، خود خطیب بغدادی نے بھی جن کو امام صاحب اور ان کے تلامذہ سے خاص کد معلوم ہوتی ہے، امام شافعی کے یہ اقوال نقل کئے ہین کہ

"مین نے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر محمد بن حسن سے علم حاصل کیا ہے، محمد بن حسن سے زیادہ میرے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے، مین نے محمد بن حسن جیسا عالم نہین دیکھا، وہ بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن انھی کی زبان مین نازل ہوا ہے،

یہ جملے تو خطیب بغدادی نے نقل کئے ہین، دوسرے تذکرہ نگارون مثلاً حافظ ابن عبدالبر، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر اور امام ذہبی وغیرہ نے اس طرح کے بیسیون جملے نقل کئے ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی اور امام محمد کے درمیان نہ تو کوئی معاصرانہ چشمک تھی، اور نہ مناظرہ و مباحثہ کی مجلس گرم ہوتی تھی، بلکہ امام محمد اور امام شافعی کے درمیان وہی تعلقات تھے، جو ایک ذہین شاگرد اور لائق استاد مین ہوتے ہین، اور ان کے علمی مذاکرون کی بھی یہی حیثیت تھی، امام محمد نے متعدد بار اُن کی املا دی ہوئی کتابین ان کو نقل کرنے کے لئے دین،

اور وہ جب تک عراق میں رہے اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہے، اس سفرنامہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب میں امام محمد کے گھر پہنچا، تو دیکھا کہ اُن کے مکان کے دروازوں اور دہلیزوں پر نقرئی اور طلائی کام بنا ہوا ہے، اس وقت مجھے حجاز کی غربت کا خیال کر کے افسوس ہوا،"

امام محمد کے گھر کا جو نقشہ اس سفرنامہ میں کھینچا گیا ہے، وہ اگر عباسی دور کے کسی حکمران کا ہوتا تو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا، مگر محمد بن حسن جیسے صاحب زہد و تقوی اور سادہ روش امام کے بارے میں یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی، رجال و طبقات کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں امام محمد کے حالات درج نہ ہوں، مگر یہ بات کسی ایک تذکرے میں بھی نہیں ملتی کہ ان کی زندگی مسرفانہ یا عیش پسندانہ تھی، تمام ارباب تذکرہ اُن کے زہد و اتقاء کے معترف ہیں، حتی کہ خطیب بغدادی بھی اس میں پیچھے نہیں ہیں، خود امام شافعی کا یہ قول تذکروں میں ملتا ہے کہ

"میں نے امام محمد جیسا متقی و پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا،"[1]

کیا یہ ممکن تھا کہ امام شافعی امام محمد کے یہ خلاف زہد و تقوی اعمال دیکھتے ہوئے اُن کے زہد و تقوی کی تعریف کرتے؟

یہ صحیح ہے کہ امام محمد کے والد اپنے بعد ایک اچھی خاصی رقم چھوڑ گئے تھے، جس کے تنہا امام محمد مالک تھے، لیکن اگر ذرا تفحص سے کام لیا جائے تو سوانح نگاروں کے متعدد بیانوں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ ساری رقم انھوں نے اپنے اوپر کم اور اپنے تلامذہ پر زیادہ صرف کی جن میں امام شافعی بھی شامل ہیں، اُن کے علمی انہماک اور سادگی کا حال تو یہ تھا کہ جب تک اہل خانہ اُن کے کپڑے تبدیل نہیں کرا دیتے تھے، وہ خود کپڑے تک نہیں بدلتے تھے، امراء سے ملنا تک پسند نہیں کرتے تھے، ایسے محتاط آدمی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تعیش پسندی میں زہد و اتقاء کی سرحد کو بھی پھاند گئے تھے، ایک بہتان کے سوا کیا ہو؟

[1] تہذیب الاسماء امام نووی یہ قول دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی نقل کیا ہے،

اس سفرنامہ میں یہ بھی ذکر ہے کہ امام محمد سے رخصت ہونے کے بعد امام شافعی نے عراق کے دوسرے شہروں اور ارض فارس اور بلاد عجم وغیرہ کا چکر لگا کر ہارون رشید کے ابتدائی عہد خلافت یعنی ۱۷۱ھ میں دوبارہ بغداد پہنچے، اور اپنے ایک خاص تلمیذ حسن محمد زعفرانی کے نام سے ایک کتاب زعفرانی تصنیف کی،

اس بیان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جسے تاریخ و روایت کی روشنی میں صحیح کہا جا سکے، سب سے پہلے امام شافعی کے ارض فارس اور بلاد عجم کے سفر کو لیجئے، آج فارس و عجم کے ہر مشہور مقام مثلاً نیشاپور، رے، قزوین، ہمدان، مرو، اصفہان وغیرہ کی تاریخیں موجود، اور ان میں ان مقامات کے معمولی سے معمولی واقعے درج ہیں، مگر کسی ایک میں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ امام شافعی ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی گئے ہوں، راوی کے بیان کے مطابق تو امام شافعی اس وقت چاردانگ عالم میں مشہور ہو چکے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا کسی جگہ جانا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں تھا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا،

اس بیان کا دوسرا جز یعنی امام شافعی ۱۷۱ھ میں دوبارہ عراق گئے، اور کتاب الزعفرانی تصنیف کی، تو اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام شافعی ۱۸۴ھ سے پہلے عراق گئے ہی نہیں، اس لئے دوبارہ اُن کے ۱۷۱ھ میں وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اس کے علاوہ اُن کے تمام سوانح نگار متفقہ طور سے لکھتے ہیں کہ امام شافعی دوبارہ عراق ۱۷۱ھ میں نہیں بلکہ ۱۹۵ھ ہجری میں گئے، بلکہ بعض سوانح نگاروں نے تو اسی آمد کو عراق میں اُن کی پہلی آمد تصور کیا ہے، اگر ان وجوہ کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ اس بیان کے مطابق زعفرانی کی ولادت کم از کم ۱۶۰ھ میں تسلیم کرنی پڑے گی، کیونکہ جب وہ ۱۷۱ھ میں امام شافعی کے محبوب شاگرد بن سکتے ہیں تو اُن کی عمر کم از کم گیارہ بارہ برس کی تو ضرور ہی تسلیم کرنی پڑے گی، اگرچہ یہ عمر بھی کم ہے مگر اس سے کم عمر والے کے لئے تو ان ائمہ کی شاگردی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر ارباب تذکرہ کے بیان کے مطابق اُن کی ولادت ۱۷۰ھ قرار دینا بالکل غلط ہے، اس لئے

[1] ۱۷۰ھ کے آخر میں ہارون رشید سریر آرائے خلافت ہوا، اس لئے مذکورہ بیان کے مطابق بغداد میں امام شافعی کی دوبارہ آمد ۱۷۱ھ قرار پاتا ہے،

تمام سوانح نگارون نے ان کی وفات کا سنہ ۲۶۰ھ لکھا ہی، اس اعتبار سے ان کی عمر سو برس تسلیم کرنا پڑے گی جو صحیح نہین ہے، امام ذہبی نے یہ تصریح کی ہو کہ وفات کے وقت اُن کی عمر ۸۰، ۹۰ کے درمیان تھی، اس اعتبار سے اُن کی عمر اگر ۹۰ برس بھی تسلیم کر لی جائے، تو اُن کا سنہ ولادت ۱۷۰ھ سے آگے نہیں بڑھتا، ظاہر ہی ۱۷۰ھ مین اُن کی ولادت اور پھر ۱۷۱ھ مین امام شافعی کا ان کے نام سے کوئی کتاب تصنیف کرنا اس سے زیادہ بعید از عقل بات دوسری کون ہو سکتی ہی، زعفرانی نے امام شافعی سے استفادہ ضرور کیا ہی اور امام شافعی نے اس نام کی اپنی ایک تصنیف بھی بھیجی ہی مگر یہ سب کچھ ۱۷۰ھ یا ۱۷۱ھ مین نہین، بلکہ ۱۹۵ھ اور اس کے بعد کے سنین مین ہوا ہے،

ایک بالکل ہی فرضی بات اس سفرنامہ مین یہ ہو کہ جب امام شافعی حران سے چلے تو ایک امیر نے کافی دولت ان کے ساتھ کر دی جس کو وہ راستہ بھر اہل علم مین تقسیم کرتے رہے، اور جن اہل علم کو خاص طور سے انھون نے اس دولت سے نوازا اُن مین احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ اور امام اوزاعی بھی تھے، امام احمد ابن حنبل کی ولادت ۱۶۴ھ مین ہوئی، اور یہ واقعہ ۱۷۱ھ سے پہلے کا بیان کیا جاتا ہے، یعنی اس وقت ان کی عمر صرف سات سال کی تھی، کیا یہ عمر اس قابل تھی کہ وہ حصول علم کے لئے سفر کرتے، اور امام شافعی کے فیض دولت سے مستفیض ہوتے؟ سفیان بن عیینہ ۱۵۰ھ سے پہلے مکہ چلے آئے تھے، اور پھر حجاز سے باہر قدم نہیں رکھا، اور اس سفر مین امام شافعی کا حجاز آنا بھی ثابت نہین ہے، پھر یہ دولت ان تک نہ جانے کیسے پہنچی، اس مین سب سے زیادہ تعجب خیز بات امام اوزاعی کا تذکرہ ہے، امام اوزاعی کی وفات ۱۵۷ھ مین ہوئی جب

۵ے علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ امام شافعی سے استفادہ کے وقت زعفرانی کی عمر ۲۰ سال کی تھی، مگر امام ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے، اس لئے کہ کوثری کے بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو زعفرانی کی ولادت ۱۷۵ھ مین قرار پاتی ہے، یا پھر اُن کے استفادہ کا ۱۹۵ھ نہیں بلکہ ۱۸۵ھ قرار دینا پڑے گا، اور یہ دونون باتین صحیح نہین ہین اسلئے کہ تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہین کہ امام شافعی سے زعفرانی نے استفادہ اُن کی پہلی آمد کے موقع پر نہین بلکہ دوسری آمد کے موقع پر یعنی ۱۹۵ھ مین کیا، اور امام ذہبی نے جو اُن کی عمر کے بارے مین تصریح کی ہے، اس اعتبار

امام شافعی کی عمر صرف سات برس کی تھی، اور وہ ابھی مکہ کی گلیون سے باہر بھی نہین گئے تھے،

اس سفرنامہ کے مرتب نے ایک افترا امام مالک پر یہ باندھا ہے کہ

"امام شافعی جس وقت اُن کی خدمت مین گئے، اس وقت اُن کے پاس تین سو لونڈیان تھین، جن کی باری صرف سال مین ایک بار آتی تھی، اس کے علاوہ امام کے پاس تین سو جوڑے مختلف کپڑون کے اور ہزارون کی تعداد مین دینار اُن کے یہان صندوقون مین محفوظ رہتے تھے"

امام مالک کے سوانح حیات کا ایک ایک واقعہ سامنے ہے، کسی ایک تذکرہ نویس نے یہ نہین لکھا ہے کہ ان کی زندگی اس قدر مسرفانہ اور عیش پسندانہ تھی، اگر کسی تذکرہ نویس نے بھی لکھا ہوتا تو امام مالک کی جلالت شان، ان کا علم و فضل، ان کا زہد و اتقا اور سادگی سے پر زندگی اسے تسلیم کرنے سے ابا کرتی، راوی نے یہ تصویر امام مالک کی نہین بلکہ کسی عباسی خلیفہ کی کھینچی ہوتی تو مناسب تھا،

آخر مین ہے کہ امام مالک کی خدمت مین جب آخری بار یعنی ۱۷۱ھ امام شافعی آئے تو انھون نے اُن کو بڑی دولت دی، اور کئی ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، جو تقریباً گیارہ سال تک ان کو ملتا رہا،

اگرچہ امام مالک کی دولت کی بہتات کا تذکرہ ہی سرے سے غلط ہے، خود امام شافعی کی زبان سے اس سفرنامہ کے راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ عراق گئے، اور امام محمد وغیرہ کی اونچی زندگی دیکھی، تو ان کو حجاز کی غربت پر بڑا افسوس ہوا، پھر آخر کار ایک ہی سال کے اندر اندر کہان کی دولت امام مالک کے پاس آگئی کہ وہ ہزارون دینار ان کو وظیفہ دیتے تھے، پھر راوی نے بیان

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸) سے بھی اُن کی ولادت ۱۷۰ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ھ قرار دی جا سکتی ہے، جب بھی استفادہ کے وقت اُن کی عمر کم از کم بیس برس ہوتی ہے،

کیا ہے کہ یہ وظیفہ ۱۷۱ھ کے بعد سے شروع ہوا، اور گیارہ برس تک جاری رہا، اس اعتبار سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ امام مالک کم از کم ۱۸۱ھ تک زندہ رہے، مگر یہ تاریخی حیثیت سے غلط ہے، امام مالک کی وفات ۱۷۹ھ ہی مین ہو گئی تھی، ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے سفر نامہ کے راوی کے بارے مین یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ

"دروغ گو را حافظہ نباشد"

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے مسلمانون کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہین، اور ساتوان زیر تالیف ہے،

یہ کتاب چھوٹی اور بڑی دونون تقطیع پر چھپی ہے،

قیمت بڑی تقطیع	قسم اول	قسم دوم	قیمت چھوٹی تقطیع	قسم اول	قسم دوم
حصہ اول	.	زیر طبع	حصہ اول	ھے ر	.
حصہ دوم	.	زیر طبع	حصہ دوم	ے ر	.
حصہ سوم	مے ر	.	حصہ سوم	لعہ ر	.
حصہ چہارم	عہ ر	.	حصہ چہارم	عہ ر	عہ ر
حصہ پنجم	معہ ر	.	حصہ پنجم	.	معہ ر
حصہ ششم	لعہ ر	.	حصہ ششم	لعہ ر	.

"منیجر"

غلطیہائے مضامین

از

جناب کوثر چاندپوری، بھوپال

"زبانون کی توسیع وترقی کے لئے دوسری زبانون کے الفاظ قبول کرنا ضروری ہے، لیکن اس عمل یعنی تعریب، تھنید اور تفریس کے لئے بڑی دیدہ وری، خوش مذاقی اور اعتدال وتوازن کی ضرورت ہے، اگر دوسری زبانون کے الفاظ لینے کا دروازہ بالکل بند کر دیا جائے، تو زبان ٹھٹھر کر رہ جائے گی، اور اگر بلا کسی شرط وقید کے مطلق اس کی آزادی دیدی جائے تو زبان بازیچۂ اطفال بن جائے گی، اس لئے اس بارہ مین صحیح اصول یہی ہے کہ خواہ مفرد لفظ لیا جائے، یا کسی لفظ کی تعریف کی جائے، دونون صورتون مین جس شکل اور جس معنی مین وہ زبان مین کھپ جائے، اور عوام وخواص دونون اس کو قبول کرلین، اسی شکل ومعنی مین وہ صحیح سمجھا جائیگا خواہ اصل معنی اور قاعدہ کے لحاظ سے غلط کیون نہو لیکن عوام وخواص کے قبول کئے بغیر محض کسی ایک فرد کے استعمال سے خواہ وہ کتنا بڑا ادیب استاد اور ماہر زبان کیون نہو، اس کا استعمال صحیح نانا جائے گا،" "م"

اردو کے خمیر مین بہت سی زبانون کے عناصر شامل ہین، ترکی، ہندی، اور سنسکرت کے اکثر الفاظ اپنی اصلی صورت مین یا کچھ تبدیلی کے بعد اردو کے ذخیرے مین جذب ہو چکے ہین، عربی اور فارسی نے بھی اس کے مزاج، قوام اور ساخت پر کافی اثر کیا ہے، اور اس قدر گہرے نقوش بنائے ہین، جو کبھی محو نہین ہو سکتے ان دونون زبانون کے الفاظ اور دوسری خصوصیات نے اردو کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ وہ عربی اور فارسی

کا ایک عکس لطیف بن کر رہ گئی ہے، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اردو نے اپنی جنم بھومی کے ساتھ پوری عقیدت
اور وفاداری کا ثبوت دیا ہے، اس نے ہندوستانی عوام اور ان کی تمدنی اور معاشرتی ضروریات، نیز جذبات کا
ہمیشہ پورا پورا ساتھ دیا ہے، اور اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ عوام اپنی ضروریات میں قدم قدم پر
اس کا سہارا لینے پر مجبور ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے، کسی قوم یا مذہب سے
اس کا کوئی رشتہ نہیں، اسے ملک کے جمہور اور ان کی تمدنی و مجلسی ضروریات نے جنم دیا، اور پھر سب اقوام نے مل
جل کر آہستہ آہستہ اسے آگے بڑھایا، اور اب وہ جمہور کی ایک زندہ اور جاندار زبان ہے، اس میں ملک کی تاریخ
ہے، اس کا تمدن ہے اس کی روایات ہیں، اس میں بچوں کے لئے میٹھی لوریاں ہیں، ملکی ترانے ہیں، اور
سب سے بڑھکر یہ کہ وہ اتحاد اور بھائی چارہ ہے جس کی کسی ملک کے عوام کو ضرورت ہوا کرتی ہے، اس
کے نقش و نگار اور خد و خال میں مسلمانوں کا بھرا ہوا آب و رنگ بھی ہے، اور ہندوؤں اور سکھوں، نیز دوسری
اقوام کا ملا ہوا غازہ بھی، اس کی پیشانی پر سجدہ کا داغ بھی ہے، اور سیندور کا قشقہ بھی، ان سب حقائق کے
باوجود عربی اور فارسی نے اردو کی زلف پریشان کے سنوارنے اور سلجھانے میں جو حصہ لیا ہے، اس سے انکار
نہیں کیا جا سکتا، ان زبانوں کے اکثر الفاظ براہ راست اردو میں شامل ہوئے، اور اپنی اسی شکل میں
اسی تلفظ کے ساتھ مستقل طور پر زبان کا جزو بن گئے، بیشمار الفاظ مقامی ضروریات اور تقاضاے وقت
کے اعتبار سے عربی قواعد کو سامنے رکھ کر ڈھالے گئے، جو فوراً ہی کھرے سکوں کی طرح بازار میں پھیل گئے،
اور ملک میں بسنے والوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا، یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، اس خصوص میں
حیدرآباد کی ٹکسال نے سب سے زیادہ کام کیا، اور الفاظ کے سکے وہاں بہت تیزی اور صفائی سے ڈھالے
گئے، اس سیلاب میں بعض ایسے الفاظ بھی زبان میں داخل ہو گئے ہیں جن کو قواعد کی رو سے صحیح نہیں کہا جا سکتا،
اور اگر اصل زبان کے قواعد کا لحاظ کیا جائے، تو انھیں غلط ہی کہنا پڑے گا، ظاہر ہے کہ غلط الفاظ کا رواج بند
نہیں کیا جا سکتا، اور اردو کے بعض اساتذہ نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے، چنانچہ ماہنامہ جادو بمبئی بابت

ماہ جون ۱۹۵۴ء میں علامہ محوی لکھنوی کا ایک مضمون "الفاظ کی صحت" شائع ہوا تھا، جس میں اردو کے
بہت سے مروجہ الفاظ کو غلط ثابت کیا گیا تھا، ساتھ ہی بعض فارسی الفاظ کی جمع عربی قاعدہ سے بنانے کی مخالفت
کی گئی تھی، اس مخالفت کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ جن الفاظ کی جمع اس طرح بنائی گئی ہے، انھیں غلط سمجھ کر
ترک کر دیا جائے، علامہ محوی کا شمار ممتاز اہل زبان میں ہے، پھر بھی اُن کے اس خیال سے اتفاق نہیں
کیا جا سکتا، اردو اگر کوئی زندہ اور جاندار زبان ہے تو ہمیں اس کے اندر وہ لوچ پیدا کرنا پڑے گا، جو ہر زندہ
اور ترقی پذیر زبان کا خاص وصف ہے، اور جو فارسی اور عربی ایسی وسیع اور ہمہ گیر زبانوں کے علاوہ انگریزی میں
بھی موجود رہا ہے، ورنہ ان الفاظ کو جنھیں اہل فارس کے عمل تفریس کی موجودگی میں نکالا جا رہا ہے، اور وہ
اردو کے خمیر میں گھل مل گئے ہیں، اردو سے نکال دیا گیا تو حالت وہی ہو جائے گی، جو ادھیڑ عمر کے آدمی کی ڈاڑھی
سے سفید بالوں کے اکھاڑ دینے سے ہو سکتی ہے، اس کی ڈاڑھی سے اتنے سفید بال الگ ہو جائیں گے کہ صورت
مضحکہ خیز بن جائے گی، صرف شاخ تراشی کا عمل زبان کے تناور درخت کو کبھی پھلنے پھولنے نہیں دیگا، جو
لوگ عربی اور فارسی قاعدے سے الفاظ کی جمع . . . . یا دوسرے اسما بنانے کے خلاف ہیں، انھیں الفاظ
کو معرب اور مفرس کرنے کے اصول کو نہ بھولنا چاہئے، اور فارسی شعراء کے ان تغیرات کو بھی یاد رکھنا چاہئے
جو انھوں نے عربی قاعدوں سے اپنی زبان کے اندر کئے، جب عربی اور فارسی نے تعریب اور تفریس کے عمل
سے اپنا دامن وسیع کیا ہے، اور انگریزی زبان کے عالموں نے بھی ترہندی کو "ٹے مرنڈ" انیسوں کو "نینی
سی" طیر دخان طیر کو ٹرو کنیڑ بنا کر اپنے لغتی ذخیرے میں جذب کر لیا ہے تو پھر اردو پر کیوں یہ پابندی عائد کی جاتی
ہے، کہ وہ ان فارسی الفاظ کی جمعوں کو اپنے جسم سے نوچ کر پھینک دے، جو عربی قواعد سے بنائی گئی ہیں، اردو
سے یہ حق نہیں چھینا جا سکتا کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ پسند کر کے اپنائے، اس مفید اور زندہ عمل کو تو
جاری ہی رہنا چاہئے، اہل فارس نے عربی قواعد سے فائدہ اٹھا کر فارسی الفاظ کے بہت سے صیغے بنائے ہیں
جن کو مشہور شعراء کی سند قبول بھی حاصل ہو چکی ہے، پھر یہ کہنا کہ "الفاظ کی جمع اس طرح لانا اور بنانا عربی الفاظ

کے لئے مخصوص ہو" (جادہ ماہ جون ۲۸ء ص ۱۱) کہاں تک درست ہے،

درحقیقت زبان کی مثال ایک ایسے درخت کی سی ہے، جو اپنی پھیلی ہوئی جڑوں کے ذریعہ گرد و پیش سے غذائی مواد جذب کرکے نشو و نما کی طاقت حاصل کرتا رہتا ہے، اور ضرورت کے اعتبار سے ایک پل کے لئے بھی اپنے اس فرض سے غافل نہیں ہوتا، مگر جب اس میں پھل آتا ہے، تو اس کے اندر اس غذائی مواد کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا، اس میں ایک مخصوص ذائقہ اور مخصوص رنگ ہوتا ہے اور یہ چیزیں اس درخت ہی سے منسوب ہوتی ہیں، اسی کے جذب کئے ہوئے مواد سے نہیں، اسی طرح اردو نے جن الفاظ کو دوسری زبانوں سے جذب کر لیا ہے، اب وہ اسی کے بن چکے ہیں اور اصل زبانوں کے قاعدوں پر انھیں پرکھنا مناسب نہیں، اگر کاغذ کی جمع کاغذات، گذارش کی گذارشات، پیام کی پیامات، نوازش کی نوازشات، نگارش کی نگارشات، جمع مونث سالم کے اصول پر (عربی قاعدے سے) بنالی گئی ہے، تو اس میں کیا قباحت ہے، اور ہم یہ کیوں سمجھیں کہ جمع مونث سالم اور مذکر الفاظ کی جمع بنانے کا وہ قاعدہ جس کی رو سے اسم مفرد کے آخر میں "الف اور ت" بڑھا کر جمع بنائی جاتی ہے، صرف عربی الفاظ ہی کے لئے مخصوص ہے، اور فارسی الفاظ میں اس قاعدے کو استعمال نہیں کیا جا سکتا، ایسا کرنے میں کوئی ادبی کفر تو لازم نہیں آتا، ایسی سینکڑوں مثالیں فارسی کے مشہور اور ممتاز اساتذہ کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی قواعد کو سامنے رکھ کر فارسی الفاظ میں تصرف کیا، اور ان سے مختلف اسماء بنائے جو آج بھی نہ صرف فارسی بلکہ اس کے اتباع کے طور پر اردو میں بھی رائج ہیں، عربوں نے بھی دوسری زبانوں کے الفاظ کو معرب کرکے اپنی زبان میں داخل کیا تھا، اہل فارس نے بھی غالباً ان سے انتقام لینے کی نیت سے ایسا کیا ہے، فارسی زبان کے ان اساتذہ نے جو ایرانی ادب کے معمار تصور کئے جاتے ہیں، اپنی زبان کے الفاظ میں عربی قواعد سے نہایت حسین تصرفات کئے،

علامہ محوی نے اپنے مضمون میں ان غلط الفاظ کی فہرست بھی درج کی ہے، جو اب اردو میں رواج پذیر

ہو چکے ہیں، اور اگر انھیں نکال دیا جائے تو اردو کے حسین رخساروں پر چیچک کے گڑھوں کی مانند بے شمار خلیے پیدا ہو جائیں،

اسی سلسلہ میں موصوف نے مہر کے اسم مفعول "ممہور" پر اعتراض فرماتے ہوئے لکھا ہے،

"مہر فارسی لفظ ہے جسے انگریزی میں سیل کہتے ہیں، اس لفظ سے عربی قاعدے کے موافق اسم مفعول ممہور بنایا گیا ہے، اور عام طور پر مستعمل ہے، حالانکہ اس کی جگہ مہر زدہ ہونا چاہئے، یعنی مہر لگا ہوا کاغذ"

(جادہ ماہ جون ۲۸ء ص ۱۰)

یہ فیصلہ کہ "مہر زدہ" اور "ممہور" میں سے کونسا لفظ سبک، خوبصورت اور قابل قبول ہے، میں اہل ذوق پر چھوڑتا ہوں، لیکن جہاں تک عربی قواعد سے فارسی الفاظ کے اسماء بنانے کا تعلق ہے، اس پر اس لئے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریقہ نیا نہیں، نہ حیدرآباد کی ٹکسال کے لئے مخصوص ہے، بلکہ فارسی کے بڑے بڑے اساتذہ کے دامن کمال پر بھی ادبی معصیت کا یہ داغ موجود ہے، بشرطیکہ اس ترقی پسندانہ اصول کو معصیت کہنا جائز ہو، ایسے تو ہر اتفاقی جذبہ ہر زمانہ میں گناہ اور سیاہ کاری کے مترادف ہی سمجھا گیا ہے، فارسی الفاظ میں عربی قواعد سے جو تصرفات کئے جاتے رہے ہیں انھیں علامہ محوی نے پرانے زمانہ کے ناواقف اہلکاروں سے منسوب کیا ہے، مولانا کا یہ ارشاد تاریخی نقطۂ نظر سے درست نہیں، اس بدعت کا تعلق براہ راست فارسی کے ارباب شعر و ادب سے ہے، چنانچہ موجی اصفہانی نے باب تفعیل سے ایک فارسی لفظ زلف کا اسم مفعول مزلف بنایا ہے،

مزلف چون شود دلبر بہ دولت میرسد عاشق خط مشکین او خاصیت بال ہما دارد

نظیری نیشاپوری اس میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے، اس نے زلف کا تثنیہ بھی بنا ڈالا ہے،

بہ تحریک نسیمے خاطرم آشفتہ می گردد

بجز درائی سر زلفین دلدار است پنداری

جس وقت عربوں نے ایران فتح کیا، اور عجمیوں سے ان کے تمدنی و معاشرتی تعلقات پیدا ہوئے، تو ضروریات نے عام اصول پر مجبور کیا کہ ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے کے لئے وہ الفاظ بول چال میں استعمال کریں جن سے بلا تکلف

مانی الضمیر ظاہر ہو سکے، اس لئے عجمی عربوں کی زبان سے جو لفظ سنتے تھے، اس کو غلط سلط استعمال کرنے لگتے تھے، پھر وہی الفاظ فارسی میں گھلتے ملتے رہے، زبانوں کے پھیلنے، بڑھنے، اور کسی فاتح زبان کے مفتوح زبان پر اثر انداز ہونے کا یہی قدیم اور تاریخی طریقہ ہے، عربی کے یہ غلط الفاظ آج بھی فارسی میں موجود ہیں، اور کسی طرح الگ نہیں کئے جا سکتے، اب تو وہ فارسی ادب کے خد و خال بن کر ابھر آئے ہیں، اگرچہ موجی اصفہانی اور نظیری نیشاپوری کی جدت کو اس ذیل میں شمار نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے نہایت صحیح طریقہ پر عالمانہ بے باکی کے ساتھ اپنا وہ حق استعمال کیا ہے، جو عربوں نے ایک ادبی روایت کی حیثیت سے انھیں دیا تھا، پھر بھی ان غلط الفاظ کی قابل ذکر مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو واقعی طور پر عربی سے ناواقفیت کی علامت ہیں،

صیقل بصفت مشبہ ہے، اور فاعلیت کے معنی پیدا کرتا ہے، چنانچہ صحاح کا مصنف لکھتا ہے،

"صقل السیف جلاءً فھو فاعل والصانع صیقل"

مگر اہل فارس فاعلیت کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے صیقل کے بعد "گر" کا لفظ بڑھا دیا کرتے تھے، جب "گر" کلمات کے آخر میں آتا ہے، تو فاعلیت ہی کے معنی دیتا ہے، جیسے شمشیرگر، کاردگر، ظہوری ترشیزی کا ایک شعر ہے :-

عشق صیقل گر آئینۂ ادراک کنیم | تیرہ گردید دل از زنگ ہوس پاک کنیم

ایسی صورت میں جب تنہا صیقل ہی کافی تھا، "گر" کا اضافہ قطعاً غلط ہے، اور ظہوری ترشیزی کا مذکورۂ بالا شعر اردو کے اس شعر کے برابر لکھا جا سکتا ہے،

شب لیلۃ القدر کی رات ہے | دل شیخ محو مناجات ہے

لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ غلطی اب عام ہو چکی ہے، اور خود اردو میں بھی قلعی گر کو صیقل گر ہی کہتے ہیں، ظہوری کے مقابلہ میں انوری کا ایک شعر دیکھئے، جس میں اس لفظ کو صانع کے معنی میں بالکل صحیح استعمال کیا گیا ہے،

بادیا آب ثمران کند اندر بستان | کہ کند باد رخ آئینہ بسوہان صیقل

اسی طرح "ساقی" کے ساتھ بھی بعض اساتذہ نے "گری" کا لفظ بڑھایا ہے، چنانچہ ظہوری ساقی نامہ میں کہتا ہے :-

بہ ساقی گری گر کند جلوہ حور | ز دستش بگیرم شراب طہور

"مربی گری" "مکتب خانہ" اور "اولیٰ تر" کی ترکیبیں بھی اہل فارس نے استعمال کی ہیں، چنانچہ محتشم کاشی کہتا ہے :-

از بسکہ در عشق جنون رسوا شدم پیرانہ سر
خندند بر من نوخطان طفلان مکتب خانہ ہم

اور خواجوے کرمانی کہتا ہے :-

مرا ز میکدہ پرہیز کردن اولیٰ تر | کہ گفتہ اند بہ پرہیز بہ شود رنجور

عربی قواعد سے ان الفاظ کو صحیح نہیں کہا جا سکتا، مکتب ظرف کا صیغہ ہے، اور اس میں ظرفیت کے معنی موجود ہیں، اس کے ساتھ "خانہ" کا لفظ بالکل بے ضرورت اور غلط ہے، اسی طرح "اولیٰ" اسم تفضیل ہے، اس کے ساتھ "تر" کی حاجت نہیں،

تمنّا اور تماشا کے الفاظ فارسی اور اردو میں عربی سے مختلف طریقہ پر مستعمل ہیں، یہ دونوں عربی کے الفاظ ہیں، اور اصل زبان میں تمنّی اور تماشی ہیں،

بہت سے عربی الفاظ کی جمع بھی فارسی میں غلط استعمال ہوتی رہی ہے، اور یہی غلطی فارسی سے اردو میں منتقل ہو گئی ہے، مگر اب کس میں قدرت ہے کہ انھیں زبان کی رگوں سے نکال سکے،

"مسلم" اسلام سے اسم فاعل ہے، فارسی میں اس کی جمع مسلمان کو تھوڑے سے تصرف کے بعد مفرد استعمال کیا جاتا ہے، اور جمع کے لئے مسلمانان لکھا اور بولا جاتا ہے،

ع : اے مسلمانان فغان از دورِ چرخ چنبری (انوریؔ)

حور حورا کی جمع ہے، فارسی مین اسے مفرد سمجھا گیا ہے، اور اس کی جمع "حوران" آتی ہے،

ع : حورانِ بہشتی را دوزخ بود اعراف (سعدیؔ)

"کافر" اسم فاعل کا صیغہ ہے، لیکن شیخ اوحدالدین کرمانی نے اس کو "ف" کے زبر سے نظم کر دیا ہے،

سہل است مرا بر سر خنجر بودن | بر پاے مراد دوست بے سر بودن
تو آمدہ کہ کافرے را بکشی | غازی چو توئی رواست کافر بودن

جو الفاظ اس وقت فارسی مین رائج ہوئے جب عربون کی فتوحات کا سیلاب ایران کی حدود سے ٹکرایا اور پھر انھیں توڑ کر اندر داخل ہو گیا، اُن کو عربی سے ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ سلسلہ آگے چل کر اس وقت بھی جاری رہا، جب ایرانیون نے عربی مین کافی دستگاہ اور مہارت پیدا کر لی تھی شیخ سعدی کو کسی طرح بھی عربی سے ناواقف نہین کہا جا سکتا، وہ اپنی تصانیف مین بے تکلف عربی عبارتین اور اشعار لکھتے چلے جاتے ہین، اگر حور کی جمع "حوران" سے پرہیز نہین کرتے، بات یہ ہے کہ ایک بار جو غلط لفظ کسی زبان مین داخل ہو کر اس کے خون مین گھل مل جاتا ہے، اس سے بچنا ممکن نہین ہوتا، اور اہلِ زبان اس سے اتنے مانوس ہو جاتے ہین کہ احتیاط کی ضرورت نہین سمجھا کرتے، ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی احتیاط زبان کے لئے مضر ہے، ایسی صورت مین انھین کسی اور زبان کے قواعد کی رو سے غلط کہنا ہی درست نہین، وہ جس صورت سے جس زبان میں رائج ہین، اُن کو اسی شکل و ہیئت مین صحیح کہا جائے گا، اردو مین دوسری زبانون کے بھی بہت سے ایسے الفاظ شامل ہین جن کی صورت اصل زبان کے الفاظ سے بالکل مختلف ہے، مثلاً چانذ جواب اردو کا لفظ بن چکا ہے، اپنی اصلی زبان مین چندرما تھا، چندرما کے مقابلہ مین چانذ کو غلط کہہ کر ترک کرنا قطعاً ناممکن ہو، جب کسی عمارت کی بنیاد مین کوئی خراب اینٹ ڈول پتھر نصب ہو جائے تو تیسری یا چوتھی منزل بن جانے کے بعد اُسے نکالنا ممکن نہین رہتا، بلکہ ایسا تصور بھی حماقت پر مبنی ہوتا ہے پھر

فارسی یا اردو سے ایسے غلط الفاظ کا اخراج جو عرصہ تک مروج رہنے کے بعد اب اس کے قوام مین شامل ہو چکے ہین، کیونکر ممکن ہو، اور اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد جب خود اس زبان کے اساتذہ مہر تصدیق ثبت کر چکے ہین انکے متعلق غلط اور صحیح کی بحث چھیڑنا کہان تک مناسب ہو، اس کوشش کو ایک لسانی تحقیق سمجھ کر سراہا تو جا سکتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا،

بہت سے ایسے الفاظ بھی ہین جو عربی مین دوسرے معنی دیتے ہین، اور فارسی مین اُن سے دوسرے معنی مراد لئے جاتے ہین، یا عربی مین فاعلیت کا مفہوم ظاہر کرتے ہین، اور فارسی مین مفعولیت کا، چنانچہ شائق کو اسم فاعل فعل لازم سمجھ کر فارسی مین عاشق کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، حزین اصفہانی کا شعر ہے،

از انجذابِ ذاتی در تست روے عالم | با آفتاب تابان ہر ذرہ ایست شائق

حالانکہ "شائق" اسم فاعل فعل متعدی ہے، اور عربی مین معشوق پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، محتشم کاشی عرب کا فاضل تھا، مگر اس کے باوجود "باطل السحر" کو "مبطل السحر" کے معنی مین نظم کر دیا ہے

باطل السحر نگہ در روز با تم گردد | کز نگہ دار از ان چشم فسون ساز مرا

اہلِ عرب مسودہ کو دال کی تشدید سے بولتے ہین، اور اس کی ضد کو "مبیضہ" کہتے ہین، اس کے برعکس اربابِ فارس دال کی تشدید سے استعمال کرتے ہین، یعنی باب فعلال کی جگہ باب تفعیل سے متعلق سمجھتے ہین، کلیم کہتا ہے :-

بہ توبہ نامہ نمی شویم از گنہ کہ بحشر | بکفِ مسودۂ زلفت یاد می خواہم

اردو مین عربی اور فارسی کا یہ اختلاف کلی طور پر اب تک موجود ہے، چنانچہ بعض لوگ عربی تلفظ سے بولتے ہین، بعض فارسی تلفظ سے، اسی شاعر نے کساد کو جو مصدر ہے "ی" کے اضافہ سے استعمال کیا ہے،

کم خریداری براے اہنر باشد نہ عیب | کے تواں ہر کسادی طعنہ بر گوہر زدن،

کمال بھی مصدر ہے مگر اساتذۂ فارس اس مین "ی" اور "ت" مصدری بڑھا دیتے ہین، سعدی کہتے ہین

اگر مانند رخسارت گلے در بوستانستے ۔۔۔ زمین را از کمالیت شرف بر آسمانستے

امن کے ساتھ بھی نظیری نیشاپوری نے یہی سلوک کیا ہے،

ظہور حسن تو امنیتے بدوران داد

کہ بادشہ ز رعیت نمی ستاند باج

ظہوری ترشیزی کہتا ہے :-

ظہوری این سخن باور ندارد ۔۔۔ کہ در ملک خطر امنیتے نیست

اور صائب نے امن کو "امون" کے معنی مین استعمال کیا ہے،

عشق سازد ز ہوس پاک دل آدم را ۔۔۔ دزد چون شحنہ شود امن کند عالم را

کمال سے کمالیت، امن سے امنیت بنانا قطعی فارسی اساتذہ کی ایجاد ہے، عربی مین یہ الفاظ بالکل نہین ہین، چنانچہ قاموس وغیرہ مین ان کا کہین ذکر نہین، مرزا صائب نے تسلی کو متسلی کے مفہوم مین استعمال کیا ہے :-

ہ اندک نسبتے عاشق تسلی می شود ورنہ ۔۔۔ بہ آہو نسبتے دوری است چشم شوخ لیلیٰ را

سنجر کاشی نے زکام کو مزکوم کے معنی مین لکھا ہے :-

کز بوئے گلت بلبلان زکام شدند ۔۔۔ چو از نسیم بخت غنچۂ نقاب نگشت

عذار (ذ زیر کے ساتھ) عربی مین رخسارون کے خط کو کہتے ہین، جو دونون جانب ہوتا ہے، لیکن خاقانی نے عذار سے رخسار مراد لیا ہے،

دل عالمے بسوزی چو عذار بر فروزی

تو ازین چہ سود داری کہ نمی کند مدارا

میر عبدالرشید کا اپنی کتاب منتخب اللغات مین یہ کہنا کہ عذار (ذ پیش کے ساتھ) رخسار کو کہتے ہین درست نہین قاموس وغیرہ سے اس کی تائید نہین ہوتی بعض اوقات اہل فارس بے ضرورت عربی جمع کی جمع الجمع بنا لیتے ہین، مثلاً خاقانی کا شعر ہے،

اے زنگ آمیز این گہرہا ۔۔۔ وے ز تو گذارش صورہا

نظیری کہتا ہے،

نیست گر دیوانہ جائے تعجب بہر چیست ۔۔۔ کز عجائب ہائے دوران دیوانہ تم رسید

غمزہ در تاخت خوش کز بنا اہل ۔۔۔ گرد وا سرارہائے پنہان فاش

مرزا صائب کا ارشاد ہے،

ہر چند صائب می روم سامان نومید می کنم

زلفش بدستم می دہد سر رشتۂ آمالہا

اہل فارس الف لام تعریف کو بھی فارسی الفاظ مین شامل کر لیتے ہین، میر سنجر کاشی نے شہنشاہ اکبر کے کوکہ اعظم خان کی مدح مین کہا ہے،

آن باذل باذل نسب آن رادین المراد ۔۔۔ آن کوکب اعظم لقب آن خانی الخانی

بوالہوس کو بھی اسی ذیل مین شمار کرنا چاہئے ذیلیے تو ہوس کا لفظ فارسی اور عربی دونون زبانون مین مستعمل ہے، لیکن معنی مختلف ہین، فارسی مین اس کو ہوا یعنی حرص کا مترادف سمجھا جاتا ہے، اور عربی مین جنون کے معنی دیتا ہے،

"الہوس بالتحریک طرف من الجنون وہو مہوس کمعظم" (قاموس)

فارسی میں آدم کا بنی آدم کے فرد پر اطلاق کیا جاتا ہے، اس سلسلہ مین مرزا صائب کا یہ شعر ایک بار اور پڑھیے،

عشق سازد ز ہوس پاک دل آدم را ۔۔۔ دزد چون شحنہ شود امن کند عالم را

ان حالات مین گذارشات، کاغذات، ادبیات وغیرہ کو دفتر کے کلرکون کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار

دیگر ان الفاظ کو زبان سے نکال دینے کا مشورہ دینا یقیناً زبان کی خدمت نہیں بلکہ بدخدمتی ہی، اگر رد و قبول کا یہ سلسلہ اس وقت شروع کیا گیا، تو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کا دامن بھی خالی ہو جائے گا،

اردو کے مشہور شاعر غالب کی ادبی عظمت اور زبان دانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہی، ایرانی الاصل[1] ہونے کے باعث فارسی مین بھی انھین یہی مرتبہ حاصل تھا، لیکن اُن کا یہ شعر سنیئے :-

غلطیہائے مضامین مت پوچھ　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہین

غلط عربی ہے، جو فاعل اور مفعول دونون کے معنی دیتا ہے، اور فارسی مین بھی اسی طرح مستعمل رہا ہی،

گو دباشد کہ کودک نادان　　بہ غلط بر ہدف زند تیرے

ع معاذ اللہ غلط کردم کہ دوزخ ذان نشان باشد

اہل ہند اس میں یاے مصدری کا اضافہ کر لیتے ہین اور اسے غلط نہین سمجھا گیا، چنانچہ غلطی کا لفظ اردو مین عام طور پر بولا اور لکھا جاتا ہی لیکن اس کی جمع کا استعمال صرف غالب ہی کا اجتہاد ہے، جب غلط الفاظ کے استعمال کی یہ کیفیت ہو کہ ہر چھوٹا بڑا، عام اور خاص شیر مادر کی طرح انھیں استعمال کر رہا ہی، تو پھر انھین زبان سے خارج کر دینے کی کوشش کیونکر بار آور ہو سکتی ہے، بچہ کے بالغ ہو جانے کے بعد اگر اس سے مان کا دودھ واپس مانگا جائے، تو وہ اپنا سارا گوشت و پوست اور ہڈیون کا ڈھانچہ دیکر بھی یہ مطالبہ پورا نہین کر سکتا، چنانچہ جو الفاظ اہل زبان کے شعور مین رچ گئے ہین، اور عام طور پر استعمال ہو رہے ہین، انھین غلط ہی نہین سمجھا جا سکتا، اسی لئے ان کو زبان کی رگوں سے کھینچنے کی کوشش ہی نہ کی جائے، تو اچھا ہی،

---

[1] غالب ایرانی نہیں سلجوقی ترک تھے، (م)

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا ابو الکلام بنام مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۵)

الہلال ۹ جنوری ۱۴ء

تضاها الغیری وابتلانی بحبها
فهلا بشئی غیر لیلی ابتلانیا

صدیقی الجلیل الاعز

افسوس کہ میں جس خط کا منتظر تھا، وہ باوجود وعدہ آپ نے نہین لکھا، اور اس طرح اس اصلاح و مشورہ کی سعی نہ کی، جو ایماناً و اخلاقاً آپ پر فرض ہی،

بہرحال آج مین اپنے شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہون لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہی، تو غیر از صبر چارہ نہین،

معلوم نہین کہ اس خط کا کیا نتیجہ نکلے، ڈرتا ہون کہ کہیں یہ بھی بدگمانیون کی نظر نہ ہو، تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہون کس عالم مین لکھ رہا ہون خدارا یقین کیجئے کہ سچائی اور صداقت، محبت و وداد، اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ مین نہین، واللہ علیٰ اقول شہید، وانہ لقسم لو تعلمون عظیم،

آپ نے پونا مین پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان

کاموں کے لئے بنایا ہے، خدا کے لئے میری سنئے، اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجئے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں، اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں، میں خود غرض ہوں، اور میری غرض میری خواہش میں عنصر اصلی ہے، تاہم میری خود غرضی آپ کے لئے مضر نہیں، بلکہ بہتر ہے، کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی وعربی سکھلا دی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں،

میرے تازہ حالات آپ کو معلوم نہیں، گھر میں علالت میری عدم موجودگی میں بڑھ گئی، اور اب اس درجہ حالت ردی ہے کہ اپنی قسمت حیات کے فیصلہ کو بہت قریب پاتا ہوں، خود میری حالت ایسی ہے کہ خدا شاہد ہے مسلسل چار گھنٹے کام نہیں کرسکتا، ورنہ آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ الہلال ایک تحریک تھی، جس نے استعداد پیدا کی، لیکن اُس استعداد سے مگا کام لینا چاہئے، اور میں نے قطعی ارادہ کرلیا ہے کہ خواہ الہلال کی کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو، لیکن کام شروع کردیا جائے، چنانچہ شروع بھی کردیا ہے، ایسی حالت میں قیامت ہے کہ اگر آپ باوجود استطاعت وطاقت رکھنے کے میری اعانت سے انکار کردیں،

آپ یاد رکھیے کہ اگر ان مصائب وموانع کی وجہ سے میں مجبور و پابگل رہ گیا تو قیامت کے دن یقیناً آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے کہ آپ نے ایک بہت بڑے وقت کے ردِ عمل کو اپنی علحدگی سے ضائع کردیا،

آپ اگر الہلال بالکل لے لیجئے، جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے، مجھے سوا اس کے اصول وپالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں، میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں، اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتا ہوں، صرف اپنے مضامین کو دیدیا کروں گا، اور کچھ تعلق نہ ہوگا، عربی کے لئے مولوی عبدالماجد صاحب وعدہ کرگز کیلئے ہے، ایک اور شخص آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے، اور وہ علناً و سراً بکلی آپ کی اڈیٹری میں روز اول سے ہوگا،

ایک وقت یہ ہے کہ ہر کام کے لئے مالی شرائط کا اظہار ضروری ہے، اور ایسا کیجئے تو آپ کہتے ہیں کہ طمع دلاتے ہو، استغفراللہ، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ بغیر کسی ایسی نیت کے محض شرائط معاملہ کے طور پر چند امور عرض کرتا ہوں،

سردست آپ تشریف لے آئیں، اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں، تیس کلکتہ کے مصارف اور قیام کے لئے ہیں، اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ دوسو پورے ہوجائیں،

پروف کریکشن کے لئے انور علی آگئے ہیں، اور اب اس کے لئے کوئی زحمت نہیں، صرف اڈیٹری کا معاملہ ہے، یہ ایک بہتر کام ہے، جو الہلال کی گرفتاریوں کی وجہ سے میں شروع نہیں کرسکتا، اب اگر اور دیر ہوگئی تو سخت نقصان ہوگا اور اسی لئے میں نے آخری فیصلہ اس کی نسبت کرلیا،

میں آپ کو پابند نہیں کرنا چاہتا، لیکن اگر آپ خود چاہیں تو جتنی مدت کے لئے کہیں معاہدہ قانونی بھی ہوجا سکتا ہے،

آپ مگا وہاں استعفا دیدیں اور کلکتہ تشریف لے آئیں، اور اس خط کا جواب لا نعم میں بذریعہ تار دیدیں، مجھکو پوری امید ہے کہ میری یہ سعی بیکار نہ جائے گی، کیونکہ میں سچے دل سے آپ کا طالب ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ سچی طلبِ مودت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے،

اگر مولانا شبلی کا خیال ہو کہ اُن کے ذریعہ سے پونا تشریف لے گئے ہیں، وہ مصر تھے اب ناراض ہوں گے تو میں خود ان سے اس معاملہ کو کہکر صاف کرلوں،

تاہم جو کچھ ہو جلد ہو،

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۶)

۱۴- مکلاؤڈ اسٹریٹ کلکتہ

۱۶ $\frac{۱۰}{۹}$ ۶ء

یا مولی الجلیل

تعلیقۂ مبارک پہنچا، پچھلے کارڈ میں آپ نے لکھا تھا کہ "غضب ہے کہ تم ضروری باتوں کا بھی جواب نہیں دیتے" سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کونسی ہوتی ہے؟

کتابین خط کے ساتھ رجسٹرڈ روانہ کی گئین لیکن کبھی کبھی ڈیلوری مین تاخیر ہوجاتی ہے،

ہان البتہ اگر کتاب الوفا بدار المصطفیٰ کا نسخہ ہاتھ آیا ہے، تو نہایت نایاب ہی، شیخ عبدالحق محدث کو بھی

غالباً نہین ملا، کیونکہ جلاء القلوب مین صرف خلاصۃ الوفا کا خلاصہ و ترجمہ ہی،

دیوان صائب سے کیا وہ نسخہ مقصود ہے جو امپیریل لائبریری مین بخط مصنف موجود ہے؟ اُس کا عکس جب

چاہین لے سکتے ہین، کیونکہ لائبریرین میری ہاتھ وے سے شناسائی ہے،

اوّل تو مین اب کلکتہ سے کہان نکلتا ہون لیکن نمایش الہ آباد کا ضعیف سا خیال ہی، مگر مسئلہ قیام پیش نظر،

الہ آباد مین میری کسی سے ایسی ملاقات نہین کہ اپنا بوجھ ڈالون، ایک دوبار مسٹر اسحاق کے ہان ٹھہرا، مگر برسبیل طفیلی کہ

جب آپ کہیں ٹھہرین گے تو آپ کے خدام و وابستگان بھی لامحالہ، مین بھی ایک جا کر گستاخ تھا کہ ٹھہر گیا،

علاوہ برین وہ زمانہ ایسا ہوگا کہ من کل فج عمیق زائرین نمایش کا ہجوم، اور ہر الہ آبادی کا گھر مہمان سرا،

پس آج چاہتا ہون کہ سپرنٹنڈنٹ سے خط و کتابت کرکے باجرت قیام کا بندوبست کر لون، کیونکہ خیمون مین

فی کس سے روزانہ لیکر انتظام کیا گیا ہی،

شہاب ثاقب کو پہلے اچھی طرح نہین سمجھا تھا، کیونکہ اس نقل مبہم و متشابہ کی کئی تاویلین ہوسکتی تھین،

مجبوراً مذہب ارباب ظواہر و محدثین اختیار کیا تھا، یا مذہب سلف، کیفیتہ مجہول والسوال عنہ

بدعۃ کہ استواء علی العرش پر بالفاظہ ایمان لانا چاہئے، لایعلم تاویلہ الا اللہ والرّاسخون فی العلم، راسخ

فی العلم سے بے بہرہ البتہ اتنی تسکین تھی کہ الا من ارتضی من رسول بھی کہین کہین آیا ہے، اب پرسش فرق

سے درجہ متکلمین اشعریہ حاصل ہوا کہ تاویل کی جرأت ہوئی، مگر منتہی درجہ ارباب کشف جہان حقائق اصلیہ بصورت

حقیقی منکشف ہوجاتے ہین،

...... کا اس کارروائی سے ایک مقصد تو ان جملون کا انتقام ہے جو اُن کی تلون مزاجی، ضمیر فروشی کی نسبت

ہمیشہ آپ کی زبان سے نکلے، پھر یہ بھی کہ ان لوگون کے عقیدے مین اپنے قد کی پستی اس وقت تک مبدل بہ بلندی

نہیں ہوسکتی، جب تک دو مردون کے قد کو پست ثابت نہ کیا جائے، مین تو کسی اردو اخبار کو خریدتا نہین، مفت

آیا کرتے تھے، سو وہ بھی اب بند، اتفاقاً مرزا صاحب نے وکگداز دکھایا، تو پہلا مضمون نظر سے گذرا تاہم آپ اس سے

بہت ارفع و اعلیٰ ہین کہ ایسے لوگون کے منہ لگین، فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا،

دیوان شرف جہان دیو بھجوا دیجئے،

کنزالعلوم کے لئے آج لکھ دیتا ہون،

کاش آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت باتین کرتا، میری قلبی حالت عجیب غریب ہو رہی ہے، لیکن افسوس

کہ بظاہر حالات جلد شرفیاب زیارت ہونے کی امید نہین،

کیف الوصول الی سعاد و دونہا

قلل الجبال و دونہن خیوف

اکتوبر مین رنگون ہی چلئے، والد کے عقیدتمند وہان کم نہین،

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۱۷)

۱۳- مکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ،

۲۰ $\frac{۱}{۱۰}$ ۶ء

یا مولی الجلیل

گو را بعہ بصریہ کے جلالۃ مرتبت کا سید الطائفہ تک کو اقرار، اور آپ تو اپنے ظہور اول مین یہان تک معترف

کہ خدایا این چہ بوالعجبی ست کہ مردان عالم را از ان محروم می کنی کہ نصیب این پیرزن است لیکن تاہم للذکر مثل حظ

الانثیین، اور سردست تو آپ کو اس آیت کے دقائق حل کرنے ہیں کہ

"الرّجال قوامون علی النساء،"

ماسٹر دین محمد نہایت وحشت انگیز خبر لائے، مین واردات مسرت و نشاط مین شریک نہ تھا، مگر اجازت دیجئے کہ ماتم مین بقدر استعداد دست و سینہ حصہ لون۔ لاحب الآفلین سرائی تو مخصوص بامثال ابراہیم ہی، مگر میرے عقیدے مین آپ امتِ مرحومہ کی اس جماعتِ ابدال سے کسی طرح کم نہین، جن مین سے ہر فرد جالیس درجہ ابراہیم خلیل اللہ سے مرتبہ مین زائد بطفیل فیضان درجۂ محبوبیت محمدیہ، کما ورد فی الحدیث[۱]، پس کم از کم آپ کو زبانِ حال سے انی وجهتُ وَجهی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفاً ضرور کہنا چاہئے، اور نیز ما انا من المشرکین جو نفوس قدسیہ عطیہ توحید سے فیضیاب ہون انھین کیا ضرور کہ آلودۂ شرک ہون یہ تو ہم ایسے بت پرستون کے لئے رہنے دیجئے،

اس زمانے کی خیرہ مذاقی دیکھئے کہ دیوان فیضی کا اڈیشن مستحق تو کتب خانہ ندوہ تھا کہ ان چیزون کا موجودہ عہد مین آپ کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہین، گورنمنٹ لائبریری الہ آباد مین اس کے دقائق و محاسن کو سمجھنے والا کون ہے اور یون ورق گردانی اور عنوان ہائے جلی کو تماشہ دیکھ لینا دوسری بات ہے، الہ آباد کی نمائش بازارِ مصر سے تو کسی طرح کم نہین لیکن جب اس کی نسبت اردو کے ملک التجار نے صاف کہدیا کہ ع

خواہان نہین کوئی وان جنس گران کا

تو پھر نمائش کے خریدارون کی حقیقت معلوم، البتہ اس وارڈون روشنی کی حمایت مین زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مقصود بیع و شرا نہین، بلکہ صرف نمائش، لیکن شاید جناب کو اس پر بھی اعتراض ہو،

بار بار چاہا کہ اپنی سرگذشت عرض کرون، لیکن مشکل یہ ہی کہ ایک دفتر بے کنار اور پھر ——— اتنے دفتر مین کہین فصل نہین، باب نہین، حیران ہون کہان سے عرض کرون اور کس قدر، ایک قصہ ہوتا تو سنا دیتا، میری داستان تو ایک مجموعۂ قصص ہی، کن کن مصیبتون کو عرض کرون،

بگذشت آنچہ گذارش کرد اُفتاد

---

[۱] یہ غالباً اشارہ کسی متصوفانہ اور موضوع روایت کی جانب ہی، "م"

مونسِ قدیم بخار کی صحبتِ شبانہ روزی نے عدیم الفرصت کر دیا ہے، چند دنون کے لئے یہ کہین تشریف لیگئے تو اپنے سلسلۂ قصص کا کوئی تازہ ترین افسانہ بالاختصار عرض کرون گا،

ع : ز انجملہ یکے قصۂ محمود و ایاز است

کنز العلوم کے لئے شیخ محمد کو کہہ دیا تھا، تعجب ہے کہ نہین بھیجا، آج اُن کو پھر لکھتا ہون باہی ہمہ اگر آپ کے لئے وقت و اشکال ہو تو مجھے بھیج دیجئے مین خود بھیج دون گا،

دواوین و تذکرون کا خیال رکھئے جب کوئی عمدہ نسخہ ہاتھ آئے، تو مجھے یاد کر لیجئے، چاہتا ہون کہ قدما و متوسطین کے تمام دواوین جمع کرون، نیز تذکرے، ورنہ مطالعہ کے لئے تو سوسائٹی مین کافی ہین،

جناب کی نئی غزلین شائع ہوئی ہین صرف خبر سنی، آج کل کوئی پرچہ نہین منگواتا،

مولینا ہدایت حسین (مولانا ان کا لقب کا لعلم ہی) لکھنو جاتے ہین، اور چاہتے ہین، کہ مولوی سید عبد الحی صاحب کا تذکرہ و علمائے ہند زیر تصنیف دیکھین، کیونکہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے لئے لکھنا چاہتے ہین، آپ ملین گے، مولوی صاحب سے کہدیجئے کہ دکھلانے مین بخل نہ کرین،

ابوالکلام

(۱۸)

کلکتہ

۲۲ ۱/۲۴ء

صدیقی العزیز :-

مصری وفد کی بڑی لمبی داستان ہے، . . . . . نے سب کو بے وقوف بنانا چاہا تھا، لیکن چونکہ مسلمانون مین بے وقوف بننے کی استعداد زیادہ ہے، اس لئے سب سے زیادہ یہی بنے، سب سے پہلے بمبئی کے چند فرصت طلبون نے ڈاکٹر امید کر کے اعلان اور مولانا عبد اللہ گاندھی کے معاملہ کو ہر طرح کے مبالغون سے آراستہ کر کے مصر پہنچایا، پھر عبد اللہ فوزان بھی اس چکر مین آگئے، اور جمعیۃ شبان قاہرہ اس غلط فہمی مین مبتلا ہو گئی،

کہ ہندوستان کے تمام اچھوت مسلمان ہونے کے لئے تیار ہو گئے ہیں، علماے ازہر کا ایک تبلیغی وفد ضرور بھیجنا چاہئے،
مالابار کے ایک طالب علم عبد القادر نے بھی بہت سی غلط سلط باتیں لکھ دیں، اور غالباً لاہور کے "علامہ" کا باتنے
بھی اس میں کافی حصہ لیا، وہ قاہرہ میں ڈاکٹر عبد الحمید سے مل چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان سے خط و کتابت کی
تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے جب ترسیلِ وفد کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے، تو شیخ ازہر اور ارکانِ جمعیۃ نے یکایک محسوس
کیا کہ صورتِ حال قابلِ اعتماد نہیں ہے، مزید معلومات حاصل کرنی چاہئے، چنانچہ اکتوبر میں شیخ مراغی کا ایک
خط مجھے وصول ہوا تھا، اور بعد کو بمبئی سے عبد اللہ فوزان کا بھی ایک خط ملا تھا، دونوں میں استفسار کیا تھا کہ
کسی تبلیغی وفد کی ترسیل سود مند ہو گی یا نہیں؟ میں نے انھیں لکھا تھا کہ اچھوتوں کے لئے مصر کا وفد یہاں
آکر کچھ نہیں کر سکتا، اس غرض سے وفد کا بھیجنا نہ صرف بے سود ہو گا، بلکہ کئی اعتبار سے مضر ثابت ہو گا، لیکن
اگر آپ وفد کا اہتمام کر چکے ہیں، تو اسے ایک صحیح اور ضروری مقصد کے لئے کیوں نہ کام میں لائیں؟ یعنی مصر
اور ہندوستان کے علمی اور اسلامی روابط کے استحکام و ترقی کے لئے بھیجیں، یہ وہ کام ہے، جو برسوں پہلے ہونا
تھا، کم از کم اب شروع کیا جائے،

معلوم نہیں پھر کیا ہوا، مصر ہی میں یہ بات قرار پا گئی تھی، یا بمبئی پہنچکر اور صورتِ حال دیکھ کر قرار دی
گئی، مگر بہر حال وفد نے محض تعلیمی نوعیت اختیار کر لی، اور یہ بہت اچھا ہوا، علماے وفد بہر حال ازہری ہی
ہیں، اس لئے کوئی زیادہ توقع تو کی نہیں جا سکتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب ازہر وہ ازہر نہیں رہا جو پچاس برس
پہلے تھا، اور جس سے شیخ محمد عبدہ کو بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا، اب ازہری مولوی بہر حال وقت کی عام
مولویانہ سطح سے بلند تر ذہنیت رکھتا ہے، اور شیخ مراغی کی اصلاحات نے تو واقعی اسے بالکل ایک نئے عالم
میں پہنچا دیا ہے،

میں نے آپ کی موجودگی کا حال جس غرض سے دریافت کیا تھا، اس سے عنقریب مطلع کروں گا، فروری
کے دوسرے ہفتہ تک تو آپ اعظم گڈھ ہی میں ہیں،

یا وش بخیر مولانا عبد السلام صاحب کا کیا حال ہے؟ اگر اعظم گڈھ میں ہوں تو سلام پہنچا دیجئے، افسوس ہے
مولوی مسعود علی صاحب نے ٹوپیاں نہیں بھیجیں، والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابو الکلام

(۱۹)

صدیقی العزیز السلام علیکم

آج مولوی عبد الرزاق صاحب نے آپ کا خط اور الجامعہ کا وہ نسخہ دکھایا جس میں آپ نے پنسل سے
اشارات کر کے بعض اغلاط واضح کئے ہیں، دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ کو اس کام کی صحت و خوبی کا اس درجہ
خیال ہے، فی الحقیقت یہی سب سے بڑی مدد ہے، جو ہم ایک دوسرے کی کر سکتے ہیں، اور ہمیں باہم ایسی ہی توقع رکھنی چاہئے،
آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ الجامعہ کے دونوں نمبر میری عدم موجودگی میں نکلے ہیں، پہلے نمبر کے لئے میں
صرف فاتحۃ الجامعہ اور "حرکۃ الخلافۃ و مطالبہا" دے گیا تھا، خیال تھا کہ جلد لکھنؤ سے واپس آجاؤں گا، اور عام مضامین
میری موجودگی میں ترتیب پائیں گے، لیکن مجھے آگرہ و پنجاب کا سفر پیش آگیا، اور مولوی عبد الرزاق صاحب نے اپنے
شوق میں بلا انتظار پرچہ مرتب کر کے شائع کر دیا، لاہور میں جب مجھے پرچہ ملا، تو اشاعت کی جتنی خوشی ہوئی تھی
اتنا ہی اغلاط پر افسوس بھی ہوا، تاہم مولوی عبد الرزاق صاحب کو مستحقِ ملامت نہیں سمجھتا، وہ جو کچھ کر رہے ہیں
یہی بہت ہے، ان کے شوق و مناسبت میں کلام نہیں، صرف ضرورتِ مشق کی ہے، چند دنوں تک مشق جاری
رہی تو قلم محفوظ ہو جائے گا،

آپ نے فاتحۃ الجامعہ پر بھی تین نشان کئے ہیں، پہلی غلطی صریح کمپوز کی غلطی ہے، کتابت کی غلطی نہیں ہے،
یعنی انّما الدّعوۃ الی الجامعۃ الشرقیۃ میں ضمیر رہ گئی ہے، باقی رہے بقیہ دو مقام تو ان میں ایک کی نسبت
بلاشبہ آپ کی اصلاح بالکل صحیح ہے، یعنی "یتحد المتخاصمون" کی جگہ "یتصالح" ہونا چاہئے، واقعی خصومت
کے لئے اتحاد موزوں نہیں ہے، صلح موزوں ہے، لیکن دوسری اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، آپ نے لکھا ہے

کر نسٹر یہ المقالات کی جگہ سنفیف ہونا چاہیے لیکن مین خیال کرتا ہون سنزیہ بھی صحیح ہی،

بقیہ مضامین مین جو غلطیان دکھلائی ہین، ان مین زیادہ تر کمپوز اور تصحیح کی غلطیان ہین، مثلاً وطنین وغیرہ
جمع مین ایک ہی کی کمی، جارت کی جگہ غلط رسم الخط جاءت، شغان کی جگہ شغانی وغیرہ ذلک، آپ کو کمپوزیٹرون کا حال
معلوم ہے، جو اردو صحیح کمپوز نہین کرسکتے، وہ عربی مین جس قدر باعثِ مصائب ہون، کم ہی، بڑی دقت تصحیح کی ہی،

مولوی عبدالرزاق بھی تصحیح مین بہت کچے ہین، غلطیان رہجاتی ہین، اور وہ تصحیح سے فارغ ہوجاتے ہین،

لیکن چند غلطیان واقعی کتابت اور تراکیب کی ہین، اور آپ کے اشارات بالکل صحیح ہیں، مثلاً الذی
کا استعمال انعقاد عقد کی جگہ، انقضاض نقض کی جگہ، من الذ قیتم انفسھم مین مفعول کا حذف وغیرہ،

لیکن ایک دو مقام پر آپ سے بھی تسامح ہوگیا ہے، مثلاً یھنئہ ھو کی جگہ یھنئہ ایاہ آپنے لکھا ہی
حالانکہ یھنئہ ھو بھی صحیح نہین ہے، اور یھنئہ ایاہ بھی نہین ہونا چاہیے، صرف یھنئہ وہان کافی و صحیح ہی،
اسی طرح باہتمام زائد کی جگہ آپنے بالغ بنادیا ہے، حالانکہ زائد بھی ٹھیک ہے، اور امثال موجود ہین، ایک جگہ گو
من نفس ملک الدولہ کی جگہ بنفس ہی، لیکن بظاہر تو وہان من ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے،

بہرحال اغلاط ضرور ہین، خصوصاً بعض تراکیب کی آپ نے خط مین لکھا ہے کہ دوسرا نمبر اغلاط سے محفوظ ہی،
لیکن شاید ابھی اچھی طرح دیکھا نہین، اس مین بھی نہ صرف کمپوز کی بکثرت غلطیان ہین، بلکہ الفاظ وغیرہ کی بھی،
الحرکۃ الھندیہ مین ایک جگہ دکانوا یصرفون قواھم لکھ گئے ہین، یعنی صرف بمعنی خرچ و بذل، یہ
اردو کا محاورہ ہے، اور عربی مین لکھ گئے،

اس سے بھی بڑھ کر غلطی یہ کی کہ سید رشید رضا کا مضمون بلا مناسب رد کے شائع کردیا، بہتر یہ تھا کہ شائع
ہی نہ کرتے، یا میرے دیکھ لینے کے بعد شائع کرتے، یہ بات اس درجہ نامناسب ہوئی ہی کہ سمجھ مین نہین آتا کہ
کیا کیا جائے،

آپ آیندہ بھی جو اغلاط دیکھیں، مولوی عبدالرزاق صاحب کو ضرور لکھدین یا مجھے مطلع کرین، اس کی

بڑی ضرورت ہے، اس مین مضائقہ و تغافل نہ کیجئے گا،

مولوی مسعود علی صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب کو سلام شوق،

کلکتہ   ۲۰ رمئی ۲۳ء

ابوالکلام

(۲۰)

صدیقی العزیز   السلام علیکم

قلبی یحن شتی بانات مستلقی   ایک ہفتہ سے زائد زمانہ گذرا کہ ایک رسالہ رجسٹری بھیجا گیا،
اب تک جواب و رسید سے محروم ہون، حیرانی ہے کہ کیا معاملہ ہے؟ شاید آپ اعظم گڈہ مین نہ ہون، رمضان المبارک
کی وجہ سے وطن آگئے ہون، لیکن اتنی مدت گذرچکی ہی کہ خط اعظم گڈہ سے آپ تک پہنچ سکتا تھا، اور وہان سے جواب
آسکتا تھا، بہرحال حقیقتِ حال سے جلد مطلع کرین، اگر کسی وجہ سے رسالہ مذکورہ کی اشاعت کا سامان نہو سکے تو
بلا تاخیر بیرنگ داروغہ الطاف حسین صاحب سکریٹری انجمن مدرسہ اسلامیہ اپر بازار رانچی کے نام بھیج دین، بوجوہ جلد
از جلد اس کی اشاعت مقصود تھی، مگر مشیتِ الٰہی کہ یکے بعد دیگرے تاخیر ہی ہوتی گئی، پہلے یہان حصول جائز
وغیرہ مین، پھر آپ کے طرف سے بھی جواب نہین ملتا، بہرحال طالب جواب ہون، اور خاموشی سخت موجب اضطراب،

ایک اور ضروری معاملہ کے لئے لکھتا ہون، مولوی فضل الحق صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ کا مدرسہ سے قطع تعلق
ہوگیا ہے، وہ ڈھاکہ اور کلکتہ جانے کے لئے مستعد تھے، مگر خیال ہوا کہ اگر دار العلوم ندوہ مین قیام ہو تو بہتر ہوگا،
دار العلوم مین پرنسپل و صدر مدرس کی جگہ خالی ہے، ایک زمانہ مین مولانا شبلی مرحوم اُن کو بلا رہے تھے، وہ
کلکتہ مین میرے مکان پر گفتگو ہوئی تھی، علوم درسیہ و معقولات مین آج ممتاز سمجھے جاتے ہین، اور تجربہ کار
و غیر متعصب، و خوش تقریر و تدریس ہین، باقی علوم دینیہ مین جو حال اکثر مدرسین وقت کا ہے، وہی ان کا ہی،
اصلاح تعلیمات و تغیرات کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہین، مین چاہتا ہون کہ آپ اس بارے مین مولوی سید عبدالحئی صاحب

معارف نمبر ۶ جلد ۲،

کو خاص طور پر بتا کیجیں کہ وہ جلد بلائے جائین، ہر طرح بہتر و موزون ہوگا،

رسالہ وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھنا ہو وہ داروغہ الطاف حسین صاحب کو لکھیئے، مولوی سلطان رخصت پر بھوپال چلے گئے اور وہ معاملہ داروغہ صاحب ہی کے اب متعلق ہے،

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

(۲۱)

صدیقی العزیز السلام علیکم، آج بعض مسائل کی نسبت سخت گمراہی پھیل رہی ہے، اور اگر اس کا سدباب نہ ہوا، تو ایک نہایت مفید دروازہ کھل کر بند ہو جائے گا، اُس کے متعلق مین نے ایک مختصر تحریر اخبارات مین شائع کرانی چاہی تھی لیکن لکھنا شروع کیا تو بہت بڑھ گئی اور اب اخبارات کے لئے حد تحمل و اندراج سے باہر ہو گئی ہے، بمجبوراً آپ کو بھیجتا ہون اور امید کرتا ہون کہ حتی الوسع جلد اور بعنوان مناسب اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائیگا،

صورتین اس کی دو ہین، ایک یہ کہ معارف مین نکل جائے، اگر آپ پسند کرین لیکن اس مین مشکل یہ ہے کہ اس ماہ کا نمبر عنقریب شائع ہونے والا ہوگا، اس مین گنجائش نہ ہوگی، اور آیندہ ماہ پر رکھا جائے تو بہت زیادہ تاخیر ہو جائیگی، اور مقصود بوجوہ و مصالح تعجیل ہے، بلکہ جتنی دیر باوجود تکمیل تحریر بھیجنے مین بوجہ قیود لاحقہ ہو گئی، اس کو بھی نہ ہونا تھا، پس اگر اس ماہ کے نمبر مین اس کا اندراج ممکن ہو، تو اقلاً نصف اول تو اس کی کوشش کیجیے، نصف ثانی آیندہ نمبر مین نکل جائے گا، اگر اس کا موقع باقی نہین رہا ہے تو پھر ایک صورت اور ہے، یعنی اس تحریر کو نسبتۃً خفی قلم اور زیادہ سطر در سطر کے ساتھ لکھوا چھپوا کر بصورت ضمیمہ زائد کے اسی نمبر کے ساتھ نکال دیا جائے، اور چند دنون کے لئے وہی نمبر کی اشاعت ملتوی رہے، اس صورت مین میرا دوسرا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا یعنی مین مستقلاً بشکل رسالہ بھی اس کی کچھ کاپیان چاہتا ہون، پس وہی ضمیمہ تین سو الگ بھی معمولی کاغذ پر چھپوا لیا جائے، صفحہ ٹائٹل اس پر لگا دیا جائے گا،

اس صورت مین معارف کے تمام اوراق، اور علحدہ رسالہ کے لئے غرضیکہ جس قدر یہ ٹکڑا چھپے، اُس کی

اُجرت و خرچ میرے ذمہ ہے، کیونکہ معارف پر اس کے ضمین ضخامت سے زیادہ بوجھ نہین پڑنا چاہیے، اور بہر حال مجکو چھپوانا ہی ہے، رقم مطلوب سے آپ مجھے مطلع کرین، تاکہ بھیج دی جائے، اگر ایسا ہوا تو موجب کمال تشکر ہوگا،

لیکن اگر یہ دونون صورتین ممکن العمل نہ ہون، تو پھر از راہ عنایت جہان تک جلد ممکن ہو اس کو بصورت رسالہ چھپوا دینے کا انتظام فرما دیجئے، پانچ سو نسخے کافی ہون گے، مطبع معارف مین چھپے اور اگر کسی وجہ سے دقت ہو تو لکھنؤ یا کانپور مین چھپوا دیجئے، اعظم گڈھ مین چھپتا تو تصحیح کی طرف سے آپ کی موجودگی اطمینان دلاتی، کیونکہ جو مسودہ بھیج رہا ہون اسمین کانٹ چھانٹ جا بجا ہے، اس صورت مین بھی فوراً اجرت طباعت سے مطلع کیجیے، تاکہ روپیہ بھیج دیا جائے،

مقصود اصلی اشاعت اور جلد اشاعت ہے، اگر الگ چھپے تو تقطیع معارف سے چھوٹی رکھی جائے یعنی مخزن کی تقطیع، کاغذ معمولی ہونا چاہیے، اور خط زیادہ جلی نہ ہو،

ایک اور ضروری بات ہے، ابتدا مین چونکہ خیال نہ تھا، کہ تحریر بڑھ جائے گی، اس لئے بلا فصل و عنوانات محض نمبرون کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا گیا لیکن اب دیکھتا ہون تو تحریر بہت بڑھ گئی، اور دریا مین کہین موڑ نہین، پڑھنے والے اکتا جائین گے، پس اب عنوانات کا قائم کرنا تو خالی از اشکال نہین البتہ جب کاتب لکھنا شروع کرے، تو اتنی ہدایت کر دی جائے کہ تحریر مین جہان جہان سے نیا نمبر شروع ہوتا ہے وہان بین السطور وسط مین صرف لفظ فصل جلی قلم سے لکھ دیا جائے، اور نمبرون کو نکال دیا جائے، مسودہ ہی مین ایسا بنا دیا جائے، اس طرح کل بائیس جگہ لفظ فصل آئے گا، کیونکہ کل ۲۲ نمبر ہین،

امید ہے کہ اس بارے مین پوری توجہ کام مین لائین گے،

ابوالکلام (۲۱ مئی ۱۹۱۹ء)

رانچی

ادبیات

آہ! مسند نشینِ شبلی

از

جناب یحییٰ اعظمی

بیٹھے بیٹھے دفعۃً ہر آنکھ کیون نم ہوگئی
کس کے غم مین ساری ملت وقفِ ماتم ہوگئی

ہوگئے رخصت جہاں سے سیدِ والاگہر
مجلسِ علم و معارف مجلسِ غم ہوگئی

جو سجائی تھی جوارِ مرقدِ استاذ مین
حیف وہ بزمِ ہنر تاراج و برہم ہوگئی

"بزمِ شبلی" تھی ابھی تک جس کی ضو سے جلوہ ریز
روشنی اس شمع کی افسوس مدھم ہوگئی

تھا نگین پر جس کے روشن سیرتِ سرورؐ کا نقش
آج نذرِ خاک وہ تابندہ خاتم ہوگئی

سیکڑون نکتے تھے باقی علم و حکمت کے ابھی
فرصتِ ہستی مگر خود دفعۃً کم ہوگئی

حضرتِ استاذ سے ملنے کی بے تاب آرزو
زندگی کے سارے کامون پر مقدم ہوگئی

وقتِ آخر آستانِ اُستاد کا چھوٹا مگر
وسعتِ خُلقِ سیادت تو مسلّم ہوگئی

تھے جو اسرارِ معارف سینۂ پرنور مین
آہ اب خاکِ کراچی اُن کی محرم ہوگئی

اے کراچی اللہ اللہ یہ ترا مجد و شرف
خاک تیری مرقدِ مجدِ مجسّم ہوگئی

اے زمینِ پاک نورِ قدس سے معمور خاک
تو ابد تک جسمِ سیدؒ سے مکرّم ہوگئی

اس تعلق سے کہ وہ دولت وہاں مدفون ہے
دونون ملکون مین بنائے ربطِ محکم ہوگئی

قدس مین پہنچا جو شورِ آہِ سیرت نگار
قدسیون کی بزم وقفِ خیر مقدم ہوگئی

بزمِ اربابِ معارف بزمِ ماتم بن گئی
ہر رفیقِ "بزم" کی آنکھ آہ پرنم ہوگئی

چلتے چلتے رُک گیا کیون خامۂ معجز رقم
ختم کیا اب مدحِ سرکارِ دوعالمؐ ہوگئی

جلد ہفتم تو ابھی تک تشنۂ تکمیل تھی
اس سفر کی آہ پھر کیا اس قدر تعجیل تھی

کیون نہ ہو جائے پریشان دفترِ علم و یقین
اٹھ گئے دنیا سے نقش آرائے ختم المرسلینؐ

رحلتِ مسند نشینِ حضرتِ شبلیؒ ہے یہ
ہے بجا گر ساری دنیائے معارف ہو حزین

ہوگئی ختم اک نفس مین مدتِ رنجِ فراق
ہوگئے سید سلیمان آج شبلیؒ کے قرین

لکھتے لکھتے نسخہ ہائے سیرتِ خیر البشرؐ
فرش سے خود ہوگئے حاضر سرِ عرشِ برین

ہے حضورِ رحمۃ للعالمین مین بار یاب
آہ خود مدحت طرازِ رحمۃ للعالمینؐ

شورِ طمطم سے فضائے قدس ساری گونج اٹھی
اور لبِ استاذ سے نکلی صدائے آفرین

وہ سلیمانِ معارف خاتم افروزِ کمال
کل تلک اقلیمِ دانش جس کے تھا زیرِ نگین

جس کی ہر تصنیف اک سرمایۂ تحقیقِ فن
جس کی ہر تالیف اک گنجینۂ اخبارِ دین

مخزنِ علم و ادب وہ خرمنِ فضل و کمال
تھے عجم سے تا عرب جس کے کل تک خوشہ چین

علم دین و حکمت و دانش کا ایسا اجتماع
جلوہ گر ہوتا ہے اک پیکر مین صدیون مین کہین

گلشنِ حسنِ تبسم جس کا روئے دل فروز
آئینہ دارِ تقدس جس کی تابندہ جبین

آج آسودہ ہے اُف خاکِ دیارِ پاک مین
فرطِ غم سے ہے سرشک افشان وطن کی سرزمین

تشنگانِ فیض کو اب غم اگر ہے تو یہ ہے
ہوگئے محرومِ فیضانِ حیاتِ آفرین

خون کے آنسو رلائے گا ہمیں اب حشر تک دل میں ہو جو داغِ حرمانِ نگاہِ واپسین

کون لکھے آج اس کا نوحہ صبر آزما جو لکھا کرتا تھا سب کا ماتمِ غم آفرین

کس دیارِ غیر میں وہ آج محوِ خواب ہے آہ سونا تھا جسے بالینِ شبلیؔ کے قرین

حق تھا جس کے جسمِ اقدس پر وطن کی خاک کو

آج وہ دولت ودیعت ہے دیارِ پاک کو

تاریخ ارتحالِ پُرملال علامہ سید سُلیمان ندوی علیہ الرحمۃ

از

جناب حکیم محمد شعیب صاحب پھلواروی

صدرِ ایوانِ علم و فضل و کمال مسند آرائے بزمِ اہلِ صفا

سید ذوِ نسب سلیمان جاہ گلِ شادابِ نخلِ آلِ عبا

حاملِ رایتِ شریعتِ حق حامیِ دین و ملتِ بیضا

کشورِ علم کے سلیمان تھے رہی آباد علم کی دنیا

انبیا ہوں کہ قطب و غوث و ولی پنجۂ موت سے کوئی نہ چھٹا

ایسے شاداب و سبز گلشن پر چل گئی موت کے خزاں کی ہوا

صرصرِ موت نے کیا تاراج ہائے وہ نخل بار ور بھی گرا

کشورِ علم کیوں نہ ہو ویران جب کہ وہ تاجدار ہی نہ رہا

تا کجے غم میں نالہ و فریاد صبر کر اختیارِ مردِ خدا

ہجری و عیسوی میں کہہ تاریخ تا ملے حق سے تجھکو اس کی جزا

ایک درجہ بڑھا کے کہہ ہجری فاضلِ دہر و سیدالعلماء
۱۳۷۳ھ

عیسوی سنہ کی جستجو جب کی ہاتفِ غیب بر ملا بولا

ایسے فاضل کی موت اے نیر

بس یہی ہے "قیامتِ صغریٰ"

سنہ ۱۹۵۳ء

(۲)

دریغا رفت آن علامۂ دہر رفیع المنزلت عالیِ درجات

وداع کرد و رفت آن مایۂ فضل بجنت یافتہ انواعِ نعمات

بدردِ فرقتش نیّر بنالد رفیقِ طفلیم افسوس وہیہات

نگندہ سر زدردِ دل بگوید سلیمان سریر العلم قدمات[1]
۱۳۷۳ھ

مختلف تاریخی مادّے

ازمولانا حبیب الرحمٰن صاحب ایم اے

کان فاضل العصر
۱۳۷۳ھ

خاتم فضلاء
۱۹۵۳ء

توفی المورّخ
۱۳۷۳ھ

فاضلِ یکتا گیا
۱۳۷۳ھ

---

[1] بصنعت تخرجہ

باب التقریظ والانتقاد

کلامِ سہیل

محمد حسن کالج میگزین سہیل نمبر

از

ڈاکٹر محمد عزیر لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی

مولانا اقبال احمد خان سہیل اُن شاعروں میں ہیں، جن کی شہرت اب تک خواص کے حلقہ تک محدود تھی، جناب نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے، پرنسپل محمد حسن انٹرمیڈیٹ کالج، جونپور نے کالج میگزین کے اس نمبر کی اشاعت سے مولانا کے کلام کو سبیلِ عام کردیا ہے، جو لوگ مولانا سہیل سے کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جہاں اُن میں طباعی اور ذہانت غیر معمولی درجہ کی ہے، وہاں اُن کی بے نیازی بھی حد سے بڑھی ہوئی ہے، اپنے کلام کے جمع کرنے کا اہتمام انھوں نے کبھی نہیں کیا، بیاض جو عموماً شاعروں کی حرزِ جاں رہتی ہے، مولانا کے قلم سے ہمیشہ ناآشنا رہی، اس کا کام انھوں نے اپنے حافظہ سے لیا، اسی لئے اُن کے بعض احباب جو اُن کی شاعری کے جوہر شناس تھے، اور اُن کی اُفتادِ مزاج سے بھی واقفیت رکھتے تھے اپنے طور پر جہاں تک ممکن ہوا، یہ تبرکات جمع کرتے گئے، لیکن یہ مجموعہ بھی ناقص اور منتشر تھا، نیاز صاحب کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ انھوں نے ان اجزائے پریشاں کو نہایت کاوش سے فراہم کیا، اور مرتب شکل میں خاص اہتمام سے شائع کردیا، اردو شعر و ادب کے دلدادہ اُن کی اس خدمت کو کبھی فراموش

نہ کرسکیں گے،

میگزین کے ابتدائی (۴۴) صفحے مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، اور خود جامع کلام نیاز احمد صاحب صدیقی کی نگارشات پر مشتمل ہیں جنسے مولانا سہیل کی شخصیت اور شاعری کے تمام نمایاں پہلو روشن ہوجاتے ہیں، اس مجموعہ میں اردو اور فارسی کلام دونوں شامل ہیں لیکن اُسے مجموعہ کہنا حقیقۃً درست نہیں، کیونکہ مولانا کی بہت سی نظمیں مصلحۃً اس سے نکال دی گئی ہیں، یہ وہ نظمیں تھیں جن میں مولانا کی ذہانت مطلق العنان ہوگئی تھی، اور جن کا ہر شعر مخالف کے لئے تیر و نشتر کا کام کرتا تھا، طنز و ظرافت کا جو حیرت انگیز ملکہ ان کو فطرت نے بخشا ہے اس کا اندازہ انہی غیر مطبوعہ نظموں سے ہوسکتا تھا،

بحیثیت نظر کلام میں سب سے پہلے جو چیز پڑھنے والے پر اثر ڈالتی ہے، وہ شاعر کے تاثرات ہیں، یہی چیز ہی جو ایک فطری شاعر کو غیر فطری شاعر سے ممتاز کرتی ہے، اور اسی کی کمی سے ہمارے اکثر شاعروں کے گلدستے کاغذی پھولوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس مجموعہ میں قصیدے، ملّی، قومی اور سیاسی نظمیں ہیں، شخصیات پر نظمیں، سہرے، غزلیں، اور متفرقات بھی شامل ہیں، جذبات کی مصوری کم و بیش سب میں پائی جاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ مولانا کی عقیدت اور محبت نعتیہ قصیدوں کے ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے، نعت و منقبت کے قصیدے اردو میں پہلے بھی بہت لکھے گئے ہیں، لیکن اکثر یا تو ثواب کی خاطر یا زورِ کلام کی نمائش کے لئے، محسن کاکوروی نعت کے میدان میں اپنے تمام پیشروؤں سے آگے نکل گئے، مگر دبستان لکھنؤ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے بطریقِ لزوم مالایلزم صنعت گری اور رعایت لفظی میں اتنا مبالغہ کیا کہ اسی کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں، اور محاسنِ شعری کے ہجوم میں خود ممدوح کے حسنِ ذات کا جلوہ ایک حد تک چھپ جاتا ہے، سہیل کے قصیدوں کا رنگ ہی اور ہے، یہاں پیرایۂ بیان کی دلآویزی ممدوح کے جمالِ دل افروز کا پرتو معلوم ہوتی ہے، اور اس شفاف نقاب میں اس کا

ہر خط و خال صاف نظر آتا ہے، نعت و منقبت کے یہ تمام قصیدے شخصیت کے ایسے مرقعے ہیں، جن کی تیاری ایک ماہر فن مصور اور حقیقت نگار مبصر کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی تھی،

ملی، قومی اور سیاسی نظموں میں بھی اصلیت نگاری کا یہی اہتمام نظر آتا ہے، مولانا کو ہندوستان سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی دوسرے محبِ وطن کو ہو سکتی ہے، لیکن وطن سے یہ شدید تعلق انہیں ملت سے رشتہ منقطع کرنے پر آمادہ نہیں کرتا، وہ صحیح معنوں میں اسلامی تصور وطنیت کے حامی ہیں، اور اُن کی یہ نظمیں اسی تصور کی آئینہ دار ہیں، ترکوں کی جنگ آزادی سے بھی وہ اتنا ہی متاثر ہوتے ہیں، جتنا ہندوستان کی جنگ آزادی سے، تاج عثمانی کے وارثوں کی "ملت فروشی" پر بھی اُن کا دل اُسی طرح جلتا ہے، جس طرح راجاؤں اور نوابوں کی "وفا شعاری" پر، مصطفےٰ کمال پاشا کی شمشیر جوہردار میں بھی اُن کو حق کی وہی بجلی نظر آتی ہے، جو گاندھی جی کی "اہنسا کی لڑائی" میں، جشنِ آزادی ہند کے موقع پر جو نظم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اعظم گڈھ میں پڑھی تھی، اس میں گاندھی، نہرو، تلک، ڈیسائی، داس، نیتاجی، بھگت سنگھ اور جھانسی کی رانی کے ساتھ انصاری، اجمل، محمد علی، آزاد، مدنی، محمود حسن، قاسم، امداد، ابو ظفر بہادر شاہ اور ٹیپو سلطان کا ذکر بھی ہے کہ ان سب نے بیرونی اقتدار سے وطن کو آزاد کرانے میں حتی الامکان کوشش کی ہے، ارباب وطن کو مبارک باد دینے کے بعد مولانا اس نظم کے آخری بندوں میں اُن خطرات کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں جو آزاد ہندوستان کی تعمیر میں پیش آسکتے ہیں، اور اتحاد و محبت کا وہ سبق یاد دلاتے ہیں، جس کی تکرار مادرِ وطن کا ہر دور اندیش فرزند کرتا آیا ہے،

غزل کا موضوع کسی زمانہ میں صرف حسن و عشق کا مضمون رہا ہو، مگر مدت سے ہمارے شعراء نے تغزل کے تنگ دائرہ سے نکل کر اس صنف سخن کو گوناگوں خیالات و جذبات کا وسیلۂ اظہار بنالیا ہے، اور مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں جو مشورے غزل کی اصلاح کے لئے دیئے تھے، اُن کو اردو کے تقریباً تمام شاعروں نے کسی نہ کسی حد تک قبول کر لیا ہے، مولانا حالی کا سب سے اہم مشورہ یہی تھا کہ غزل کی شاعری سے

پرہیز کیا جائے اور اُنہی واردات کا اظہار کیا جائے جن سے شاعر فی الواقع متاثر ہوا ہو، سہیل کی غزلیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات و واقعات سے کتنا متاثر ہیں، اُن کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ملے گی، جو وطن اور اہلِ وطن کے ذکر سے خالی ہو، بعض غزلیں شروع سے آخر تک حبِّ وطن کے جذبات سے لبریز ہیں، سیاسی شاعری سہیل سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے، لیکن اس مضمون کے بیان میں تغزل کا دلکش انداز جس حد تک اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے، اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے مل سکے گا، انگریزوں کی فتنہ انگیزی کا ذکر مولانا اپنی نظموں اور غزلوں میں بار بار کرتے ہیں لیکن اُن کی نگاہ میں فرزندانِ وطن کی پستیٔ فطرت بھی کم المناک نہیں، جس کی بدولت آزاد ہندوستان کے باشندوں کی ایک بڑی جماعت آج بھی تباہ و برباد ہو رہی ہے، اور ان کی شدت اس وجہ سے اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ یہ غیروں کے نہیں بلکہ اپنے ہی وطنی بھائیوں کے ہاتھ سے ہو رہی ہیں، جشن آزادی کی مبارک باد والی نظم کے بعد صفحات (۱۱۳) (۱۲۴) اور (۱۳۲) کی غزلیں بھی پڑھیئے، اور دیکھئے کہ خواب آزادی کی تعبیر کس شکل میں ظاہر ہوئی، ان غزلوں کے مضمون کا اندازہ مندرجۂ ذیل چند اشعار سے جو نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں بخوبی ہو سکے گا،

ہماری پستیٔ فطرت نہ تھی یوں آشکار اب تک ... کہ تھی دیوارِ زندان رازِ دل کی پردہ دار اب تک

گیا ساقی تو کیا بیخود ہیں اس کے جرعہ خوار اب تک ... سروں میں ہے اُسی صہبائے دوشیں کا خمار اب تک

چمن کو ہے ہجومِ رنگ و بو کا انتظار اب تک ... نہاں ہے گرد رہ میں کاروانِ نو بہار اب تک

بہا ڈالے ہزاروں خانمان سیلِ حوادث نے ... دلوں میں تہ نشیں ہے پھر بھی صدیوں کا غبار اب تک

دلِ برباد کی خاک آج بھی دوشِ صبا پر ہے ... کھٹکتا ہے زمانہ کی نظر میں یہ غبار اب تک

میری سادہ دلی تھی یا جنون یہ سب بجا لیکن ... میں سمجھا تھا ترے عہد وفا کو استوار اب تک

....

کہی ہو شبِ غم کس طرح بسر پھیلا وہ فسانہ کیا کہئے ... کانوں میں ہو جب کھٹکا گجرِ سحر رودادِ شبانہ کیا کہئے

آئی شبِ غم کے بعد سحر نمناک رہا پھر بھی منظر
وہ غنچۂ گل کا ہنس ہنس کر شبنم کو رلانا کیا کہئے

کیوں بزمِ طرب کے صدر نشیں پائیں گے بھی اب ہم اہلِ حزیں
کل وادیٔ غم میں ہم دونوں تھے شانہ بشانہ کیا کہئے

گھر اپنا شاید جن کے لئے آئے سرِ صحرا جن کے لئے
پوچھیں وہی ہم سے نام و نشاں تو اپنا ٹھکانا کیا کہئے

........(۵)........

مجھ سے پوچھو نہ مزاجِ دلِ ناشاد ابھی
میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیٔ فریاد ابھی

بجلیاں آئیں جو باہر کو وہ رخصت بھی ہوئیں
شعلہ افگن ہے مگر برقِ چمن زاد ابھی

لوٹئے خاک اس آزادیٔ گلشن کی بہار
ہے ہماری لئے یہ جنتِ شداد ابھی

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل
ہوش گم کردہ ہیں مرغانِ نو آزاد ابھی

——..o:::o..——

جو لوگ غزل کے پامال مضامین کو نئے نئے اسلوب سے پیش کر دینا ہی شاعری کا کمال سمجھتے ہیں اُن کی لطف اندوزی کا سامان بھی سہیل کی غزلوں میں بکثرت موجود ہے، واردات عشق کا بیان ہو یا حقائق و معارف اور اخلاق و موعظت کا، مولانا کی رنگین نوائی ہر نکتہ کو جان فزا اور ہر بیان کو کیف آور بنا دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُن کو زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، مضمون کوئی بھی ہو وہ اس کو ایسے لطف و خوبی سے ادا کر دیتے ہیں کہ اس سے بہتر اسلوب مشکل ہی سے خیال میں آ سکتا ہے، اس مجموعہ میں یوں تو غزلوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں لیکن ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا جب شعر کہنے بیٹھتے ہیں تو روانی کا کیا عالم ہوتا ہے، اکثر غزلیں طولانی ہیں، اور ایسی تو بہت کم ملیں گی، جن میں ایک ہی مطلع پر قناعت کی ہو، بیشتر غزلوں میں چار چار، پانچ پانچ مطلعے بھی ملتے ہیں، کہیں یہ تعداد سات تک بھی پہونچ جاتی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ جس شخص کی قادر الکلامی کا یہ حال ہو، اور جس کا جوشِ طبیعت ایک مرتبہ برانگیختہ ہونے کے بعد آسانی سے فرو نہ ہوتا ہو، اس کا مجموعۂ کلام اتنا ہی کیوں ہے، اس کا جواب

وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو مولانا کی بے نیازی سے واقف ہیں، انھوں نے شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا، اور شعر کہنے کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوئے، جب تک کسی خاص واقعہ یا حالت نے اُن کو مجبور نہ کر دیا، غالب کی طرح گو وہ یہ نہ کہہ سکتے ہوں کہ

ع "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"

لیکن اس دعوے کو تو ہر ایک تسلیم کرے گا کہ

ع "کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

یہ چند سطریں ناظرینِ معارف سے کلامِ سہیل کا تعارف کرانے کے لئے پیش کر دی گئی ہیں، نقد و تبصرہ کا حق مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، شاہ معین الدین صاحب ندوی کا، اور پروفیسر آل احمد سرور ادا کر چکے ہیں، البتہ اس مجموعہ کے سرسری مطالعہ میں دو لفظ ایسے نظر آئے جن کے محلِ استعمال کی طرف مولانا سہیل کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، ص ۱۴ کی نظم "فتح سمرنا" کا ایک شعر ہے، ـــ

وجودِ قوم اب تک مبتلائے صرعِ غفلت تھا
مگر اب تھا اسے اک نعرۂ خونِ شہیداں کا

گذارش یہ ہے کہ صرع (مرگی) میں جو غفلت ہوتی ہے، وہ مریض کے اعمال یا بے عملی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایک اضطراری کیفیت ہوتی ہے، جو دفعۃً اس پر طاری ہو جاتی ہے، ایسا مریض مجبورِ محض سمجھا جاتا ہے اور ہر ایک کو اس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، برخلاف اس کے کسی قوم کی غفلت خود اس کے افعالِ اختیاری یا جمود و تعطل کا نتیجہ ہوتی ہے، ایسی قوم اپنی حالت کی ذمہ دار خود سمجھی جاتی ہے، مسلمانوں کا حال یہی تھا، اس لئے اُن کی غفلت کو "صرعِ غفلت" کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، دوسرا لفظ اسی نظم کے ص ۹ ۱۴ پر ہے،

کبھی ہے برقِ خاطف نعرۂ اِنّا فتحنا میں
تعجب کیا پڑ گئی ہلچل جو یونانی کلیساؤں میں

برق کی صفت چمک ہے، جسے خاطف کی اضافتِ توصیفی نے اور واضح کر دیا ہے یعنی وہ بجلی جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں، "نعرۂ اِنّا فتحنا" کے ساتھ "برقِ خاطف" کا تعلق محلِ نظر ہے،

یہ مقام رعد کا تھا، جس میں کڑک ہوتی ہے، نہ کہ برق کا جو صرف چمک رکھتی ہے،

اس مجموعہ کے آخری (۳۲) صفحات فارسی نظموں پر مشتمل ہیں، جو خاص خاص موقعوں پر کہی گئی تھیں، ان میں وہ نظمیں بھی ہیں، جو مولانا نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں علی گڈہ کالج میں لکھی تھیں، اور جن کی وجہ سے ان کا سکہ اسی وقت دنیائے شاعری پر بیٹھ گیا تھا، شاعرانہ صناعیوں کے اعتبار سے فارسی کلام کا پایہ اردو کلام سے یقیناً زیادہ بلند ہے، بعض قصیدوں پر اساتذۂ ایران کے قصیدوں کا دھوکا ہوتا ہے، اور صنعت گری کا یہ نیرنگ دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے، غالب کا ایک شعر یہاں بھی موقع کے حسب حال ہے،

فارسی بین تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

لیکن بس ایک حد تک، فارسی نظموں میں "نقش ہائے رنگ رنگ" کی جلوہ گری تو بلا شبہہ مسلّم ہے، لیکن مولانا کے "مجموعۂ اردو" کو بیرنگ کہنا کسی طرح درست نہیں، دنیائے ادب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس "مجموعۂ اردو" کو غالب ناقابلِ اعتنا سمجھتے تھے، اسی پر ان کی شہرت کا قصرِ رفیع تعمیر کیا گیا، اور فارسی کے "نقش ہائے رنگ رنگ" صرف کلیات کی زینت بن کر رہ گئے ہیں،

مولانا سہیل کو بھی اپنی فارسی نظموں پر بڑا ناز ہے، اور ان کے مقابلہ میں اپنے اردو کلام کو وہ بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں دیتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانہ خود ایک ایسا جوہر شناس ہے جس کی نگاہِ انتخاب کبھی خطا نہیں کرتی، اور جس کا فیصلہ ہمیشہ بے لاگ ہوتا ہے،

——— • ———

مطبوعاتِ جدیدہ

نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند والباکستان (عربی)
از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۰ صفحات مطبوعہ مصر، قیمت ۸ /؎ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور،

یہ کتاب دراصل اسلامی ممالک میں جماعتِ اسلامی اور اس کے مقاصد، اور کاموں کے تعارف کے لئے لکھی گئی ہے، مگر اس میں ضمناً ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات سے لے کر اس وقت تک اسلام کی دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کی تجدید و اصلاح کی کوششوں کی مختصر سرگذشت بھی تحریر کر دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں عرب تجار اور علماء و مشائخ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت، ہندوستان میں صحیح اسلامی تعلیمات کی نہ پہنچنے، اور اُن سے عام مسلمانوں کی ناواقفیت کے اسباب، اسلام کی تبلیغ سے مسلمان سلاطین خصوصاً تیموریہ کی غفلت اور اُن کے غیر اسلامی نظامِ حکومت کے اثرات، اکبر کی گمراہیوں سے شعائرِ اسلامی کا زوال و انحطاط، حضرت مجدد الف ثانی کا کارنامہ اور اسلام کا دوبارہ احیاء، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور اورنگزیب، حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے اخلاف، حضرت سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید اور اُن کے متوسلین کے مجاہدہ، اور علمی و اصلاحی کارناموں کا مختصر تذکرہ ہے، اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کی تباہی، سرسید احمد کی سیاسی و تعلیمی خدمات، علی گڈہ کالج کا قیام، دارالعلوم دیوبند کی تاسیس، اور اُن کے محاسن و معائب، اور طرابلس و بلقان کی جنگ سے گذشتہ جنگِ عظیم کے خاتمہ اور پاکستان کے قیام تک مسلمانوں کی سیاسی سرگذشت آ گئی ہے، اور آخر میں جماعتِ اسلامی کے قیام کی تاریخ اور ہندوستان و پاکستان میں اس کے تبلیغی، اور

اصلاحی کارناموں کی تفصیل ہے، لائق مصنف ممتاز صاحب علم اور مشاق صاحب قلم ہیں، اور عربی زبان پر
ان کو اہل زبان جیسی قدرت ہے، اس لئے انھوں نے بڑی خوبی اور اختصار و جامعیت سے ہندوستان میں
مسلمانوں کی تجدید و اصلاح کی مختصر تاریخ تحریر کر دی ہے، مگر اُن کی روایتی شدت اور عصبیت اس کتاب
میں بھی جابجا نمایاں ہے،

نقدِ اقبال از جناب میکش اکبرآبادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۱۶ صفحات، کاغذ،
کتابت و طباعت بہتر، قیمت ےر، پتے (۱) میکش اکبرآبادی میوہ کٹرہ آگرہ، (۲) کتابخانہ
دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ، (۳) حکیم مرزا احسان علی بیگ صاحب نرنکاری بازار ۱۱۳
راولپنڈی پاکستان،

دوسرے مفکرین کی طرح اقبال کے افکار و تصورات میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی ہے،
اور وہ رفتہ رفتہ پختگی کی منزل کو پہنچے ہیں، اُن کے کلام اور تصانیف کا مطالعہ کرنے والے عام طور سے یہ غلطی
کرتے ہیں کہ اُن کے ہر دور کے خیالات کو ایک ہی درجہ دیتے ہیں، جس سے کہیں کہیں ان میں تضاد نظر آتا
ہے، یا اُس کے کسی ایک پہلو کو لے لیتے ہیں، اور دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جس سے اُن کے
خیالات کی غلط ترجمانی ہوتی ہے، مثلاً انھوں نے ملائے مکتبی، علمائے سوء اور عجمی اور ویدانتی تصوف کی مذمت
کی ہے، مگر اس سے علمائے حق، اکابر صوفیہ اور صحیح اسلامی تصوف کی مخالفت کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے،
اُن کے کلام میں بکثرت ان کی ثنا و صفت ہے، یا ایک زمانہ میں وہ نسلی و جغرافی قومیت و وطنیت کے قائل
تھے، مگر پھر اُس کی مضرت دیکھ کر اس کے خلاف ہو گئے، اسی طریقہ سے اُن کے کلام اور تصانیف میں
وحدۃ الوجود کے متعلق متضاد خیالات ملتے ہیں، جو یا تو اس نظریہ کے بارہ میں ان کی رائے کی تبدیلی کا نتیجہ
ہے، یا انھوں نے وحدۃ الوجود کے کسی خاص مفہوم کی مخالفت و موافقت کی ہے، لائق مصنف نے مذکورہ
بالا کتاب میں اس نظریہ کی تاریخ اور اس کی مختلف تعبیروں کی روشنی میں اقبال کے خیالات کی تنقید

و تصحیح کی ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ مختلف اقوام و مذاہب اور حکما و فلاسفہ میں وحدۃ الوجود کے معنی و مفہوم
مختلف رہے ہیں، اور قدیم حکما و فلاسفہ کا وحدۃ الوجود جو سراسر مادہ پرستی ہے، یا ویدانت
کا رہبانی وحدۃ الوجود جس کی بنیاد ہمہ اوست، فنائے مطلق، کائنات کی نفی، تعطل اور ترک عمل پر ہے
نہ صرف اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، بلکہ اس سے دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اس لئے وہ سراسر
باطل ہے، لیکن اکابر محققین صوفیہ جس وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، وہ ان تمام خرابیوں سے پاک اور عین
حق ہے، اور اس سلسلہ میں مختلف اقوام و مذاہب کے نظریۂ وحدۃ الوجود کی تاریخ اور اُس کے مختلف
مفہوموں کی پوری تفصیل آگئی ہے، اردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے، جس میں اس تفصیل کے ساتھ اس نظریہ
پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب کے مباحث دقیق اور صرف خواص کے مطالعہ کے لائق ہیں، علمی حیثیت سے تو
اس قسم کے مباحث مفید کہے جا سکتے ہیں لیکن عملی حیثیت سے بے کار اور بے نتیجہ ہیں، اور اس قسم کے دقیق و
پیچیدہ مسائل سے دور ہی رہنا بہتر ہے،

احوالِ غالب مرتبہ جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب آرزو، تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۲
صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت: لعہ ر پتہ: انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ،

عرصہ ہوا علی گڈھ میگزین کا غالب نمبر نکلا تھا، جس میں غالب کے حالات و سوانح پر اردو کے
بہت سے اصحاب علم و قلم کے مضامین تھے، بعض کے نام یہ ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر
مسعود حسن رضوی، پروفیسر محمد حمید خان، مالک رام ایم اے، غلام رسول مہر، مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر
عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود صاحب، مختار الدین احمد آرزو، وغیرہ، اگرچہ اردو میں غالب پر متعدد
مبسوط و محققانہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور اُن کے متعلق معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے، مگر یہ نمبر
معلومات کے تنوع کے لحاظ سے ان سب میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بیشتر مضامین محققانہ
ہیں، اور ان سے غالب کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور ان کی زندگی کے بعض نئے گوشوں

روشنی پڑتی ہے، اور بعض چیزوں کی تصحیح و تنقید بھی ہو جاتی ہے، اس لئے یہ نمبر غالب کے متعلق مفید متنوع اور محققانہ معلومات کا اچھا مجموعہ ہے، اب انجمن ترقی اردو نے اس کو احوال غالب کے نام سے مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس اڈیشن کے بعض مضامین میں مفید ترمیمیں کی گئی ہیں، بعض تو اتنے بدل گئے ہیں کہ نئے بن گئے ہیں، اور کئی اور نئے مضامین کا مستقل اضافہ ہے، اس لئے احوال غالب پہلے اڈیشن سے بہت زیادہ جامع و مکمل ہے، نوادر میں خود غالب کے قلم سے اُن کے خود نوشت حالات کا فوٹو اور اُن کی متعدد تصویریں ہیں، اس کی اشاعت سے اردو میں غالب پر ایک مفید اور قابلِ قدر کتاب کا اضافہ ہوا،

آفتاب تازہ از جناب سکندر علی وجد، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ پتہ چتنا پرکاش لمیٹڈ بیگم بازار حیدر آباد دکن،

آفتاب تازہ مشہور ترقی پسند شاعر سکندر علی وجد حیدر آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے، وہ اپنے طبقہ کے شعرا میں جوش ملیح آبادی اور مجاز ردولوی کے بعد سب سے زیادہ قادر الکلام اور خوش مذاق شاعر ہیں، اور ترقی پسندی کے باوجود حسنِ مذاق کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے، ان کے کلام میں ترقی پسندی کے رسمی اور فرسودہ نعروں کے بجائے ترقی پسندی کی صحیح روح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شاعر کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، چنانچہ ان کا کلام افکار و تصورات کی رفعت و بلندی کے ساتھ خیالات کی لطافت و رعنائی اور حسن بیان کی دلآویزی کا بھی دلکش نمونہ ہے، ایک خوش مذاقی یہ بھی ہے کہ اپنی روایات و مذہب کا مذاق نہیں اڑایا گیا ہے، اس مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیات بھی اور دونوں ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ ہیں، اگر نوجوان ترقی پسند شعرا کلامِ وجد کو اپنے لئے نمونہ بنائیں، اور آفتاب تازہ سے روشنی حاصل کریں، تو بہت سی غلطیوں اور بدمذاقی سے بچ سکتے ہیں،

"م"